Registered No. L. 4186

جلد ۲۸
عدد ۴

ربیع الثانی ۱۳۶۵

۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"
دارالاسلام - جمال پور - پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ ۸؍
قیمت سالانہ پانچ روپے

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے :-

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جاسکتی ہے، ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جاسکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جاسکتے ہیں، اُن کا جواب کیا ہے؟ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں :-

قیمت حصہ اول ۰-۱۴-۱   حصہ دوم ۰-۸-۲   حصہ سوم ۰-۱۲-۱

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ — مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور۔ پٹھانکوٹ (پنجاب)

فہرست مضامین

جلد ۲۸ | ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ مطابق مارچ ۱۹۴۶ء | عدد ۳

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر مرکنٹائل پریس، چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن دارالاسلام پٹھانکوٹ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اب سوال کے دوسرے حصہ پر غور کیجیے۔ یعنی اس مسئلہ پر کہ شروع شروع میں انبیائے کرام علیہم السلام کس طرح مخاطب کرتے ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کی بعثت ہوتی ہی اس زمانہ میں ہے جبکہ حق و باطل میں امتیاز، وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ناممکن ہو جاتا ہے اور عملاً تمام نظام زندگی حق کی جگہ باطل کے قبضہ میں آجاتا ہے۔ ایسے زمانہ میں حق صرف نبی کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اس کے دائرہ سے باہر حق کے کچھ اجزاء تو پائے جا سکتے ہیں لیکن پورے حق کا پایا جانا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے اگر انبیائے کرام ابتدا ہی میں لوگوں کو اس طرح مخاطب کریں کہ اے کافرو، ایمان لاؤ! اے مشرکو، توحید اختیار کرو! یا زیادہ سے زیادہ رعایت دے کر یوں کہیں کہ اے منافقو، اخلاص اختیار کرو! تو صورت واقعہ کے اعتبار سے ان کا یوں دعوت دینا بیجا نہیں ہو سکتا کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ ان کے دائرہ سے باہر جو کچھ ہے وہ صرف کفر و شرک اور نفاق ہی ہے لیکن جن لوگوں نے حضرات انبیائے کرام کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ وہ لوگوں کو اے انسانو، اے لوگو، اے میری قوم، اے اہل کتاب، اے وہ لوگو جو یہودی ہوئے، اے وہ لوگو جو نصرانی ہوئے، اے وہ لوگو جو ایمان لائے، وغیرہ الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں اور ان کا یہی طرز خطاب اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک قوم ان کو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور حق دشمنی سے اس قدر مایوس نہ کر دے کہ ان کے لیے قوم سے علیحدگی اور ہجرت کا وقت آجائے۔ جب قوم اپنی حق دشمنی میں اس قدر آگے بڑھ جاتی ہے کہ اہل حق کا وجود اس کو اپنے اندر کسی طرح گوارا نہیں ہوتا اور تائید حق کی بڑی سے بڑی دلیل بھی بیکار ہو کے رہ جاتی ہے اس وقت انبیاء اپنی قوم کو چھوڑتے ہیں اور یہی وقت ہوتا ہے کہ وہ صاف صاف الفاظ میں ان لوگوں کے لیے

کا فر و مشرک وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اپنے کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں۔

یوں تو یہ حقیقت ہر نبی کی دعوت میں واضح ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلعم کی دعوت کے مختلف مدارج پر جس شخص کی نظر ہو گی وہ اس حقیقت کا کسی طرح انکار نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے عہد کے بادشاہ کو جن الفاظ سے خطاب کیا ہے ان میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ مخاطب کو ایک کافر و مشرک کی حیثیت سے مخاطب کر رہے ہیں لیکن جب دعوت و تبلیغ پر ایک مدت گزر گئی اور دلائل و معجزات کی ساری قوت قوم کی ضد کے مقابل میں نہ صرف بے اثر رہی بلکہ یہ ضد اس قدر بڑھ گئی کہ پوری قوم ان کی جان کے در پے ہو گئی اس وقت انھوں نے قوم سے علیحدگی کا اعلان کیا اور جن الفاظ میں کیا ہے ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے شرک و کفر کے ساتھ رواداری کی جو آخری حد ہو سکتی ہے وہ ختم ہو گئی اور اب نہ صرف یہ کہ وہ ان کے کفر و شرک کا اعلان کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اپنی نفرت و عداوت کا بھی اعلان کرنا چاہتے ہیں۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ

تمھارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان چیزوں سے جن کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو، بالکل بری ہیں۔ ہم نے تمھارا انکار کیا اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت و نفرت کا اعلان ہو گیا

ٹھیک یہی حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ہے۔ قرب ہجرت سے پہلے کی کسی سورہ میں بھی یہ بات نہیں مل سکتی کہ آپ نے اپنی قوم کو یا اہل کتاب کو کافر و مشرک یا منافق وغیرہ کے الفاظ سے مخاطب کیا ہو۔ بالکل ابتدائی سورتوں میں زیادہ تر خطاب یٰایّھا الانسان کے الفاظ سے ہے یا یا ایھا الناس یا یٰقوم کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اہل کتاب کے لیے یا اھل الکتاب کے یا اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ منافقین کے لیے بھی فتح مکہ کے بعد تک وہی عام لفظ یا ایھا الذین آمنوا کا استعمال ہوتا رہا اور صراحت کے ساتھ ان کو اے منافقو!

کے الفاظ سے کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔ لیکن جب ایک مدت کی دعوت و تبلیغ کے بعد قوم پر اللہ کی حجت پوری ہوگئی اور نہ ماننے والوں نے نہ صرف یہ کہ مانا نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرلیا اس وقت آپ نے ہجرت فرمائی اور کفار قریش کو صاف صاف، اے کافرو کے الفاظ سے مخاطب کیا اور ان سے اور ان کے دین سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ. لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ، وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ، وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ، وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ، لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ

کہہ، اے کافرو نہیں پوجتا ہوں جسے تم لوگ پوجتے ہو، اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے کا جسے تم لوگ پوجتے آئے اور نہ تم لوگ پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں، تمھیں تمھارا دین اور مجھے میرا دین!

یہ ساری احتیاط صرف لوگوں کو کافر و مشرک نہ قرار دینے کے حد تک تھی۔ لوگوں کے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کو کفر و شرک قرار دینے میں انبیائے کرام نے کبھی معمولی رعایت بھی نہیں فرمائی بلکہ اگر کبھی ان کے دل میں مخاطب کے لیے کسی رواداری کا کوئی وسوسہ پیدا ہوا یا مخالف حالات کی وجہ سے ان کو کوئی تردد لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا اور کفر کو کفر اور شرک کو شرک ثابت کرنے میں ان کو سخت سے سخت تر کردیا۔ اس کا سبب العیاذ باللہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لوگوں کو کافر و مشرک قرار دینا چاہتے ہوں لیکن محض فتنہ کے اندیشہ یا اس خیال سے کہ لوگ دعوت سے بدک جائیں گے ایسا کرنے سے احتراز کرتے ہوں کیونکہ اگر اس طرح کی مصلحت پرستی ان کے ہاں جائز ہوتی تو کفار جس طرح کے سمجھوتہ کی تجویزیں پیش کرتے تھے وہ بڑی آسانی سے ان کو منظور کرکے سارا جھگڑا ختم کردے سکتے تھے لیکن معلوم ہے کہ اس دعوتِ حق کے بارہ میں انھوں نے نہ تو کبھی کسی رواداری کی گنجائش رکھی نہ کبھی لومۃ لائم کی پروا کی۔ اس وجہ سے یہ سوال قابل غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے باوجود انھوں نے کفر و شرک کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے میں اتنی احتیاط کی اور ان سے براءت اور علیحدگی کے

اعلان میں اتنی دیر لگائی ؟

ہمارے لیے اس سوال پر غور کرنا اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ جن چیزوں کو قرآن یا حدیث صحیح میں کفر و شرک کہا گیا ہے، ہم عام علماء کی طرح، فضول قسم کی تاویلیں کر کے، ان کو ایمان و توحید ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اللہ اور رسول نے جس چیز کو شرک اور کفر کہا ہے، اس کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتے کہ اس سے اپنا پندار ایمان مجروح ہو رہا ہے یا دوسروں کے کبر نفس پہ ضرب پڑ رہی ہے۔ ہمارے اس رویہ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ جب ہم فلاں فلاں اعمال یا عقائد کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں تو لازماً ان لوگوں کو کافر و مشرک بھی قرار دیتے ہیں جو ان اعمال و عقائد میں مبتلا ہیں اور چونکہ بدقسمتی سے اس زمانہ میں مسلمان عام طور پر ان اعمال و عقائد کے مرتکب ہیں اس وجہ سے ہم پر یہ الزام تھوپ دیا جاتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے سواد اعظم کی تکفیر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا گروہ ہم پر مداہنت اور خوف خلق کا الزام لگاتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جب تم تسلیم کرتے ہو کہ فلاں فلاں اعمال و عقائد کفر و شرک ہیں تو جو لوگ آج ان کے مرتکب ہیں ان کی تکفیر کیوں نہیں کرتے اور ان سے برأت کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ ان دونوں جماعتوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اوپر کے سوال پر غور کیا جائے۔

ہمارے نزدیک انبیائے کرام علیہم السلام اعمال کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے باوجود ان کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے اور ان سے اعلان برأت میں جو دیر لگاتے ہیں اس کی دو نہایت اہم وجہیں ہیں :

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بندوں کو جو کچھ سرزنش و ملامت ہے وہ اتمام حجت اور تبلیغ کامل کے بعد ہے۔ اگر اتمام حجت اور تبلیغ کے بغیر لوگوں پر گرفت یا ان سے اظہار بیزاری جائز ہوتی تو اللہ تعالیٰ انبیاء کو نہ مبعوث فرماتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ انبیائے کرام لوگوں کو کافر قرار دینے اور ان سے اعلان برأت کرنے سے پہلے ان کو اتنا موقع دیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے اور ان کے

انکار کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور وجہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ کام ایک مدت کی تبلیغ و تعلیم کا محتاج ہے۔ انبیاء کے فترہ کے زمانہ میں جو تاریکی چھا جاتی ہے وہ اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس کے اندر خواص کو بھی راہ حق سجھائی نہیں دیتی چہ جائیکہ عوام کالانعام۔ اس وجہ سے ہر گروہ اس بات کا محتاج ہوجاتا ہے کہ اس کو بار بار تذکیر و تبلیغ کی جائے اور چونکہ غلطیاں اور گمراہیاں روایت بن کر دلوں میں رچ بس جاتی ہیں اور ان کے ساتھ لوگوں کے اغراض وابستہ ہوجاتے ہیں اس وجہ سے اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے مٹانے کے لیے ایک مدت تک جہاد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام دیر طلب ہے اس وجہ سے حضرات انبیاء پورے صبر و استقلال کے ساتھ ایک لمبی مدت تک اس کام میں صرف کردیتے ہیں۔ یہاں تک کہ حق اس قدر واضح ہوجاتا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جن کے باطل کے ساتھ اغراض وابستہ ہوتے ہیں کوئی اور اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ جب حقِ تبلیغ اس حد تک پورا ہوجاتا ہے تب انبیاء کے لیے یہ بات جائز ہوتی ہے کہ وہ منکرین کے کفر و شرک کا اعلان کر کے ان سے علیحدہ ہوجائیں۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ جب پوری سوسائٹی کا نظام حق کی جگہ باطل کی بنیاد پر قائم ہو کر چلنے لگتا ہے تو ان لوگوں کے لیے بھی حق کی پیروی ناممکن ہوجاتی ہے جو حق کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت زندگی کے ہر گوشہ میں فساد اس طرح گھس جاتا ہے کہ کسی محتاط سے محتاط آدمی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ فساد کے کچھ جراثیم نگلے بغیر سانس لے سکے۔ ایسی صورت میں اگر اس مجبوری کا لحاظ کیے بغیر انبیاء کرام لوگوں پر کفر و شرک کے فتوے جڑ کر ان سے برائت کا اعلان کردیں تو یہ بہتوں پر نہایت شدید ظلم ہوگا۔ اس وجہ سے وہ تکفیر اور اعلان برائت سے اپنا کام شروع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تبلیغ و دعوت سے ایسا ماحول پیدا ہو کہ اس کے اندر اہل حق اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ یہ ماحول جب پیدا ہونے لگتا ہے اور زندگی کی وہ راہ کھل جاتی ہے جس پر حق پرست چل سکتے ہیں اگرچہ وہ تنگ اور دشوار گذار ہی ہو تب وقت آتا ہے کہ جو لوگ اس کو چھوڑ کر محض اپنی تن پروری اور جھوٹی نمائشوں کی خاطر باطل کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں ان کے کفر کا بھی اعلان کردیا جائے اور ان سے علیحدگی بھی اختیار کرلی جائے۔

حضرات انبیائے کرام کا اسوۂ حسنہ یہی ہے۔ اگر ہم اس سے موجودہ حالات میں رہنمائی حاصل کریں تو یہ امر بالکل واضح ہے کہ اس وقت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں جو حالات ہیں وہ بہت سے اعتبارات سے انبیاء کے فترہ کے زمانہ سے اشبہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب آج بے کم وکاست ہمارے اندر موجود ہے اس وجہ سے اس وقت دنیا کسی نبی کی ہدایت کی محتاج نہیں ہے اور نہ اب قیامت تک کسی نبی کی محتاج ہوگی لیکن ہدایت خلق اور مسلمانوں کو حق پر استوار رکھنے کے لیے ہمارا شرعی نظام خلافت کا نظام تھا جو ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے اس وجہ سے اس وقت مسلمان یا دنیا کے دوسرے انسان جن خرابیوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہو چکے ہیں ان میں مبتلا ہونے پر وہ سزا کے نہیں بلکہ رحم کے مستحق ہیں۔ ہم اس مضمون کی پچھلی قسطوں میں اس بات کو وضاحت کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے اب دنیا پر اتمام حجت کا فرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ڈالا ہے اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی بتائی ہوئی صورت یہ ہے کہ مسلمان خلافت کا نظام قائم کریں جو ایک طرف دنیا کو نیکی اور بھلائی کے راستہ کی دعوت دے دوسری طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ خلافت کا نظام قائم نہ رہنے کی وجہ سے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی پوری نہیں ہو رہی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات پوری نہیں ہو رہی ہے بلکہ عملاً ساری دنیا ایک باطل نظام کی گرفت میں آچکی ہے۔ اور باطل ایسی قوت و شوکت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے کہ حق کے لیے موجودہ نظام زندگی میں کوئی جگہ ہی سرے سے باقی نہیں رہی ہے۔ نظام تعلیم، نظام تمدن، نظام معاشرت، نظام سیاست ہر چیز حق سے منحرف اور باطل کی مددگار ہے یہاں تک کہ اس کے زیر سایہ اگر کوئی چھوٹا بڑا کام دین کے نام سے کیا بھی جا رہا ہے تو وہ بھی وقت کی فضا کی ناسازگاری کی وجہ سے باطل ہی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ نیک سے نیک انسان، جو فی الحقیقت نیکی اور سچائی کے راستہ ہی پر چلنا چاہتا ہے، آج چند قدم بھی بغیر مزاحمت کے نہیں اٹھا سکتا۔ اگر دور والے اسے تھوڑی دیر کے لیے بخش دیں تو قریب والے ہی اس سے الجھتے ہیں اور کسی طرح نہیں چاہتے کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی راہ میں دو قدم بھی آگے بڑھ سکے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھے

کہ "بدی کی راہ فراخ ہے اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس کے چلنے والے تھوڑے ہیں"۔ یہ چیز آج آنکھوں سے مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ باطل کی منزل پر پہنچنے کے لیے فراخ سڑکیں ہیں، دو رویہ درختوں کا سایہ ہے، تیز رو سواریاں ہیں، حفاظت کے لیے بدرقہ ہے، ہر منزل پر عیش و آرام ہے۔ آپ جس وقت چاہیں اس پر سفر کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس حق کی راہ پہلے ہی قدم پر رُندھی ہوئی ہے۔ اگر آپ ہمت کر کے اس مزاحمت کو دور کر سکے تو آگے کی راہ میں ہر قدم پر خطرہ ہے یہاں تک کہ شروع سے لیکر آخر منزل تک خطرہ کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اور کوئی شخص اس راہ میں آج سر لیے ہوئے پاؤں رکھ ہی نہیں سکتا۔ ایسے نازک اور پرآشوب زمانہ میں یہ بات ذرا تعجب انگیز نہیں ہے کہ لوگ راہ سے بے راہ ہو گئے۔ تعجب انگیز اگر کوئی بات ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ گمراہی کے اتنے سامان مہیا ہونے اور شیطان کے ایسے عالمگیر تسلط کے باوجود، خدا کے کچھ بندوں کو اللہ کا نام یاد کیسے رہ گیا! یہ بیچارے داد کے مستحق ہیں نہ کہ ملامت کے، اور سینہ سے لگا لیے جانے کے لائق ہیں نہ کہ کاٹ پھینکے جانے کے۔ جن لوگوں نے اتنے نامساعد حالات کے اندر اپنی شمعِ ایمان زندہ رکھی اگرچہ وہ کتنی ہی مضمحل حالت میں سہی، وہ اپنے پاس اس بات کی سند رکھتے ہیں کہ اگر ان کو موافق حالات میسر آتے تو وہ بہتر سے بہتر مسلمان ہوتے۔ اس وجہ سے ان کی غلطیوں اور غیر شعوری گمراہیوں یا اضطراری ضلالتوں کی بنا پر ان کو ایمان سے محروم قرار دے کر ان سے نفرت کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں ایمان و اسلام کے صحیح مقتضیات کا شعور بیدار ہو۔

یہ سلوک تو ہمارا ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں، عام اس سے کہ اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی حقیقی ہے یا ظاہر دارانہ۔ باقی رہیں غیر مسلم قومیں تو انصاف یہ ہے کہ ان کے بارہ میں بھی، اگر اپنی ذمہ داریوں کا ہمیں ٹھیک ٹھیک احساس ہو، تو تبلیغ اور اتمام حجت سے پہلے ہم کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم ان کو کافر سمجھیں یا کافر قرار دے کر ان سے بیزاری اور علیحدگی کا اعلان کریں۔ تبلیغ و اتمام حجت کے متعلق ہم اس سلسلہ کی کسی پچھلی قسط میں لکھ چکے ہیں کہ اس کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہے کہ مسلمان نامی ایک برا بھلا گروہ موجود ہے اور وہ کچھ الٹی سیدھی تدبیریں تبلیغ کے لیے کرتا ہے بلکہ اس کے خاص شرائط ہیں اور جب تک وہ اپنے تمام شرائط کے ساتھ پوری نہ کی جائے اس وقت تک اصلی الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جو گمراہ ہیں، بلکہ ان لوگوں پر ہے جو گمراہوں کو ہدایت کا راستہ بتانے پر مامور تھے مگر انھوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ ان لوگوں کے بارہ میں اگر ہم ٹھیک ٹھیک وہ روش اختیار کریں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی تو پہلا فرض یہ ہوگا کہ ان میں سے جو اہل کتاب ہیں ان پر اس طرح حجت قائم کریں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب پر حجت قائم کی اور جو اہل کتاب نہیں ہیں ان کو انسانیت اور فطرت کے

ان مبادی کی اساس پر دعوت دیں جو ہمارے اور ان کے بلکہ تمام بنی نوع آدم کے درمیان مشترک ہیں۔ اس تبلیغ کو ایک مدت تک جاری رہنا چاہیے۔ اتنی مدت تک کہ جن کے اندر قبول حق کی کچھ بھی صلاحیت ہے وہ حق کی طرف کھنچ آئیں اور اہل باطل اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کردیں کہ ان کا باطل میں پڑے رہنا کسی واقعی غلط فہمی کا نتیجہ نہیں بلکہ سراسر شرارت اور بدنفسی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد بلاشبہ اہل حق کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ایسے شریروں کے کافر ہونے کا فیصلہ کریں اور ان سے اعلان برأت کردیں۔ یہ جہاد کبیر انجام دیے بغیر جو حضرات ساری دنیا کے کفر کا فیصلہ کیے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آج اگر کسی طرح ان کے ہاتھوں میں طاقت منتقل ہوجائے تو ان کو حق ہوگا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو قرآن نے کافروں اور مشرکوں کے ساتھ کرنے کا حکم دیا ہے، وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اس غلط فہمی میں شاید وہ اس وجہ سے پڑے رہنا چاہتے ہیں کہ اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی یہ نہایت اچھی راہ ہے۔

بہرحال اگر آج انبیاء کے طریقہ پر کوئی دعوت حق بلند ہوتی ہے تو وہ نہ تو اس مفروضہ سے شروع ہوسکتی ہے کہ دنیا میں چالیس کروڑ مسلمان ہیں، یہ تعداد بڑھا کر پچاس یا ۶۰ کروڑ تک پہنچائی ہے، اور نہ اس مفروضہ سے شروع ہوسکتی ہے کہ داعیوں کی مختصر سی جماعت کے سوا باقی دنیا سب کافر و مشرک ہے اور ان کے ساتھ وہی معاملہ روا ہے جو قرآن و حدیث میں کافروں اور مشرکوں کے ساتھ کرنے کے لیے بتایا گیا ہے بلکہ وہ اس نقطہ سے شروع ہوگی کہ ایک مدت سے دنیا میں دعوت حق کا کاروبار معطل ہے، اس وجہ سے ایک طرف تو وہ گروہ بے شمار عملی و اعتقادی گمراہیوں میں مبتلا ہوگیا ہے جو اللہ کی طرف سے ہدایت خلق پر مامور کیا گیا تھا اور دوسری طرف جو قومیں تبلیغ و دعوت کی محتاج تھیں اس چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے نہ قرآن کے اچھوں کو ان کے بروں سے علیحدہ ہی کیا جاسکا اور نہ ان کے بروں پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہی پوری کی جاسکی۔ اس جذبہ اور اس احساس ذمہ داری کے ساتھ جو تبلیغ ہوگی نہ تو اس میں خود پرستی کا گھمنڈ ہوگا اور نہ دوسروں کی تحقیر و تکفیر کی کوئی گنجائش ہوگی بلکہ ہر شخص اپنی ذمہ داری کے احساس سے گرانبار ہوگا اس وجہ سے یہ مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کو اپیل کرے گی۔ اور اگر یہ کام صحیح طریق پر، اپنے تمام شرائط کے ساتھ جاری رہا تو وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے تمام صالحین کو چھانٹ کر ایک مرکز پر جمع کردے گا اور حق و باطل میں نہ صرف امتیاز کرنا بلکہ حق کے راستہ پر چل کر زندگی بسر کرنا بھی ہر شخص کے لیے آسان ہوجائے گا۔ اس وقت بلاشبہ اللہ کی حجت ہر شخص پر پوری ہوجائے گی اور جو لوگ حق کی اس وضاحت کے بعد بھی نظام کفر ہی کے ساتھ چمٹے رہنا چاہیں گے، نہ صرف ان کے کفر کا فیصلہ ہوجائے گا بلکہ اہل حق کے لیے یہ بات بھی جائز ہوگی کہ وہ حق کے دشمنوں سے

اپنے ہر قسم کے دوستانہ روابط قطع کرلیں یہاں تک کہ وہ ان لوگوں کو بھی کوئی مہلت نہ دیں جن میں حق دشمنی کا جذبہ ہے اگرچہ خود ان کے اندر ابھریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باطل پر جینے کی مہلت آدمی کو اس وقت تک ملنی چاہیے جب تک اس کے سامنے حق واضح نہیں ہو سکا ہے یا نظام حق کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے پورے حق پر چلنا ممکن نہیں ہے لیکن جب یہ دونوں عذر ختم ہو جائیں یعنی راہ حق واضح بھی ہو جائے اور چلنے والے قافلے اس پر چل کر منزل مقصود تک پہنچ بھی سکیں تو باطل پر جمے رہنے دینے کے لیے نہ کوئی عقلی وجہ ہو سکتی نہ اخلاقی۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آج جو لوگ دعوت دین کی تجدید کے لیے اٹھیں گے وہ اگرچہ ہر اس بات کو جو کفر و شرک ہے کفر و شرک ہی کہیں گے اور لوگوں کے اعمال و عقائد میں جہاں ان کا کوئی شائبہ موجود ہوگا بے دھڑک اس کی نشاندہی بھی کریں گے لیکن اس کے باوجود نہ ان کو کافر و مشرک سمجھیں گے، نہ کافر و مشرک کہیں گے اور نہ کافر و مشرک قرار دے کر ان سے برأت کا اعلان کریں گے یہ تبلیغ و دعوت کا دور ہے جس کا اصلی کام یہ ہے کہ لوگوں میں کفر و ایمان اور اسلام و جاہلیت کا امتیاز پیدا ہو جب یہ امتیاز پیدا ہو جاتا ہے یا وہ شرائط پورے ہو جاتے ہیں جو یہ امتیاز پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں تب وہ وقت آتا ہے کہ ان لوگوں کے کفر کا فیصلہ کیا جائے جو اپنے کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح کا امتیاز رکھنے والی صالح اور با اختیار جماعت ہی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ کافروں کی تکفیر کرے اور اس طرح کی جماعت ہی کا یہ منصب بھی ہے کہ وہ تکفیر کے ذریعہ سے اپنے اندر کے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کرتی رہے جو اس کے اصولوں سے بغاوت کریں۔ آج جبکہ اس طرح کی صالح اور با اقتدار جماعت کوئی موجود نہیں ہے اور نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شرعی نظام قائم ہے کسی شخص کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ کسی کی تکفیر کرے۔ آج جو لوگ دین کی کوئی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں ان کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں میں کفر و اسلام کی معرفت پیدا کریں تاکہ وہ صالح اور با اقتدار جماعت وجود میں آئے جو لوگوں کو اسلام کی راہ پر قائم رکھ سکے۔ اور یہی طریقہ آج مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو کفر سے بچانے کا ہے نہ کہ وہ طریقہ جو عام طور پر ہمارے علما نے اختیار کر رکھا ہے۔ اور جس کو غلط فہمی سے مسلمانوں کو کفر سے بچانے کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اس دور میں کفر سے بچانے میں معین ہی ہے اور نہ کسی با اقتدار اور صالح جماعت کے سوا کسی کو اسکے اختیار کرنے کا حق ہی ہے۔

الٰہ آباد کو روانگی:۔ امیر جماعت اور مرکز کے رفقا ۲ اپریل کو لاہور سے بذریعہ ہوڑہ ایکسپریس ساڑھے نو بجے رات کو روانہ ہوں گے اور لکھنؤ براہ بریلی کے راستے ۴ اپریل صبح سویرے الٰہ آباد پہنچ جائیں گے۔

لاہور سے الٰہ آباد تک آمد و رفت کا کرایہ تقریباً تیس روپے ہوں گے۔

قیم جماعت اسلامی

تفہیم القرآن

(۳۵)

یونس

(از رکوع ۴ تا وسط رکوع ۷)

اسی طرح تو ان سے پہلے کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں، پھر دیکھ لو اُن ظالموں کا کیا انجام ہوا۔ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائیں گے اور کچھ نہیں لائیں گے، اور تیرا رب اُن مفسدوں کو خوب جانتا ہے[۵۱]۔ اگر یہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لیے ہے اور تمھارا عمل تمھارے لیے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں[۵۲]۔

[۵۱] ایمان نہ لانے والوں کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ "خدا ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے"۔ یعنی وہ دنیا کا منہ تو یہ باتیں بنا کر بند کر سکتے ہیں کہ صاحب ہماری سمجھ میں بات نہیں آتی اس لیے نیک نیتی کے ساتھ ہم اسے نہیں مانتے، لیکن خدا جو قلب وضمیر کے چھپے ہوئے رازوں سے واقف ہے وہ ان میں سے ایک ایک شخص کے متعلق جانتا ہے کہ کس کس طرح اس نے اپنے دل و دماغ پر قفل چڑھائے، اپنے آپ کو غفلتوں میں گم کیا، اپنے ضمیر کی آواز کو دبایا، اپنے قلب میں حق کی شہادت کو ابھرنے سے روکا، اپنے ذہن سے قبول حق کی صلاحیت کو مٹایا، سن کر نہ سنا، سمجھتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کی اور حق کے مقابلہ میں اپنے تعصبات کو، اپنے دنیوی مفاد کو، اپنی باطل سے الجھی ہوئی اغراض کو اور اپنے نفس کی خواہشوں اور رغبتوں کو ترجیح دی۔

[۵۲] یعنی خواہ مخواہ جھگڑنے اور کج بحثیاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میں افترا پردازی کر رہا ہوں تو اپنے عمل کا میں خود ذمہ دار ہوں تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور اگر تم سچی بات کو جھٹلا رہے ہو تو میرا کچھ نہیں بگاڑتے، اپنا ہی کچھ بگاڑ رہے ہو۔

ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تیری باتیں سنتے ہیں، مگر کیا تو بہروں کو سنائے گا خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟[۵۱] ۴۲
ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تجھے دیکھتے ہیں، مگر کیا تو اندھوں کو راہ بتائے گا خواہ انھیں کچھ نہ سوجھتا ہو؟[۵۲] ۴۳

---

۵۱ ایک سننا تو اُس طرح کا ہوتا ہے جیسے جانور بھی آواز سُن لیتے ہیں۔ دوسرا سننا وہ ہوتا ہے جس میں معنی کی طرف توجہ ہو اور یہ آمادگی پائی جاتی ہو کہ بات اگر معقول ہوگی تو اسے مان لیا جائے گا۔ جو لوگ کسی تعصب میں مبتلا ہوں، اور جنھوں نے پہلے سے فیصلہ کر لیا ہو کہ اپنے موروثی عقیدوں اور طریقوں کے خلاف اور اپنے نفس کی رغبتوں اور دلچسپیوں کے خلاف کوئی بات، خواہ وہ کیسی ہی معقول ہو، مان کر نہ دیں گے، وہ سب کچھ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی کچھ سن کر نہیں دیتے جو دنیا میں جانوروں کی طرح غفلت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور چرنے چگنے کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، یا نفس کی لذتوں اور خواہشوں کے پیچھے ایسے مست ہوتے ہیں کہ انھیں اس بات کی کوئی فکر ہی نہیں ہوتی کہ ہم یہ جو کچھ کر رہے ہیں" صحیح بھی ہے یا نہیں۔ ایسے سب لوگ کانوں کے تو بہرے نہیں ہوتے مگر دل کے بہرے ہوتے ہیں۔

۵۲ یہاں بھی وہی بات فرمائی گئی ہے جو اوپر کے فقرے میں ہے۔ سر کی آنکھیں کھلی ہونے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ان سے تو جانور بھی آخر دیکھتا ہی ہے۔ اصل چیز دل کی آنکھوں کا کھلا ہونا ہے۔ یہ چیز اگر کسی شخص کو حاصل نہ ہو تو وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتا۔

ان دونوں آیتوں میں خطاب تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر ملامت ان لوگوں کو کی جا رہی ہے جن کی اصلاح کے آپ درپے تھے۔ اور اس ملامت کی غرض بھی محض ملامت کرنا نہیں ہے بلکہ طنز کا یہ نشتر اس لیے چبھویا جا رہا ہے کہ ان کی سوئی ہوئی انسانیت اس کی چبھن سے کچھ بیدار ہو اور ان کی چشم و گوش سے ان کے دل تک جانے والا راستہ کھلے تاکہ معقول بات اور دردمندانہ نصیحت وہاں تک پہنچ سکے۔ یہ انداز بیان کچھ اس طرح کا ہے جیسے کوئی نیک آدمی بگڑے ہوئے لوگوں کے درمیان بہترین اخلاقی سیرت کے ساتھ رہتا ہو اور نہایت اخلاص و دردمندی کے ساتھ اُن کو اُن کی اس گری ہوئی حالت کا احساس دلا رہا ہو جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں اور بڑی معقولیت و سنجیدگی کے ساتھ انھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو کہ ان کے طریق زندگی میں کیا خرابی ہے اور صحیح طریق زندگی کیا ہے۔ مگر کوئی نہ تو اس کی پاکیزہ زندگی سے سبق لیتا ہو، نہ اس کی ان خیر خواہانہ نصیحتوں کی طرف توجہ کرتا ہو، اور اس حالت میں عین اُس وقت جبکہ وہ ان لوگوں کو سمجھانے میں مشغول ہو اور وہ اس کی باتوں کو سنی ان سنی کیے جا رہے ہوں، اُس کا کوئی دوست آ کر اس سے کہے کہ میاں، یہ تم کن بہروں کو سنا رہے ہو اور کن اندھوں کو راستہ دکھانا چاہتے ہو، ان کے تو دل کے کان بند ہیں اور ان کی ہیے کی آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں۔ اور یہ کہنے سے اُس دوست کا منشا یہ نہ ہو کہ وہ مرد صالح اپنی سعی اصلاح سے باز آ جائے بلکہ یہ ہو کہ شاید اس طنز اور ملامت ہی سے ان نیند کے ماتوں کو کچھ ہوش آ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔[1] (آج یہ دنیا کی زندگی میں مست ہیں) اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دنیا کی زندگی انھیں ایسی محسوس ہوگی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھیرے تھے۔[2] (اس وقت تحقیق ہو جائے گا کہ) فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا[3] اور ہرگز وہ راہِ راست پر نہ تھے۔ جن برے نتائج سے ہم انھیں ڈرا رہے ہیں ان کا کوئی حصہ ہم تیرے جیتے جی دکھا دیں یا اس سے پہلے ہی تجھے اٹھا لیں، بہرحال انھیں آنا ہماری ہی طرف ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے۔

ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔[4] پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آجاتا ہے تو اس

---

[1] یعنی اللہ نے انھیں کان بھی دیے ہیں اور آنکھیں بھی اور دل بھی، اور اس نے اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز ان کو دینے میں بخل نہیں کیا ہے جو حق و باطل کا فرق دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ضروری تھی، مگر لوگوں نے خواہشات کی بندگی اور دنیا کے عشق میں مبتلا ہو کر آپ ہی اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہیں، اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنے دلوں کو اتنا مسخ کر لیا ہے کہ ان میں بھلے بُرے کی تمیز، صحیح و غلط کے فہم اور ضمیر کی زندگی کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔

[2] یعنی جب ایک طرف آخرت کی بے پایاں زندگی ان کے سامنے ہوگی اور دوسری طرف یہ پلٹ کر اپنی دنیا کی زندگی پر نگاہ ڈالیں گے تو انھیں مستقبل کے مقابلہ میں اپنا یہ ماضی نہایت حقیر محسوس ہوگا، اور اس وقت ان کو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی سابقہ زندگی میں تھوڑی سی لذتوں اور منفعتوں کی خاطر اپنے اس ابدی مستقبل کو خراب کر کے کتنی بڑی حماقت کا ارتکاب کیا ہے۔

[3] یعنی اس بات کو کہ ایک دن اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

[4] "امت" کا لفظ یہاں محض قوم کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ ایک رسول کی آمد کے بعد اس کی دعوت جن جن لوگوں تک پہنچے وہ سب اس کی امت ہیں۔ نیز اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ رسول ان کے درمیان زندہ موجود ہو، بلکہ رسول کے بعد بھی جب تک اس کی تعلیم موجود رہے اور ہر شخص کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن ہو کہ وہ درحقیقت کس چیز کی تعلیم دیتا تھا، اس وقت تک ایسے سب لوگ اس کی امت ہی قرار پائیں گے اور ان پر وہ حکم ثابت ہوگا جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد تمام دنیا کے انسان آپ کی امت ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک قرآن اپنی خالص صورت میں شائع ہوتا رہے گا۔ اسی وجہ سے آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ "ہر قوم میں ایک رسول ہے" بلکہ ارشاد یہ ہوا ہے کہ "ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔"

کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔ ۵۱ کہتے ہیں اگر تمہاری یہ دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہوگی؟ کہو "میرے اختیار میں نفع و ضرر کچھ بھی نہیں، سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ۵۲ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے، جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی۔ ۵۳" ان سے کہو، "کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آجائے (تو تم کیا کر سکتے ہو)، آخر یہ ایسی کونسی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں؟ کیا جب وہ تم پر آپڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟ ـــــ اب بچنا چاہتے ہو؟

---

۵۱ مطلب یہ ہے کہ رسول کی دعوت کا کسی گروہ انسانی تک پہنچنا گویا اس گروہ پر اللہ کی حجت کا پورا ہو جانا ہے۔ اس کے بعد صرف فیصلہ ہی باقی رہ جاتا ہے، کسی مزید اتمام حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہ فیصلہ غایت درجہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جو لوگ رسول کی بات مان لیں اور اپنا رویہ درست کر لیں وہ اللہ کی رحمت کے مستحق قرار پاتے ہیں اور جو اس کی بات نہ مانیں وہ عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ عذاب دنیا اور آخرت دونوں میں ہو یا صرف آخرت میں۔

۵۲ یعنی میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہ فیصلہ میں چکا دُوں گا اور نہ ماننے والوں کو میں عذاب دوں گا، اس لیے مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ فیصلہ چکائے جانے کی یہ دھمکی کب پوری ہوگی۔ دھمکی تو اللہ نے دی ہے، وہی فیصلہ چکائے گا اور اسی کے اختیار میں ہے کہ فیصلہ کب کرے اور کس صورت میں اس کو تمہارے سامنے لائے۔

۵۳ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد باز نہیں ہے۔ اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جس وقت رسول کی دعوت کسی شخص یا گروہ کو پہنچی اسی وقت جو ایمان لے آیا بس وہ تو رحمت کا مستحق قرار پایا، اور جہاں کسی نے اس کو ماننے سے انکار کیا یا ماننے میں تامل کیا کہ فوراً اس پر عذاب کا فیصلہ نافذ کر دیا گیا۔ نہیں، اللہ کا قاعدہ یہ ہے کہ اپنا پیغام پہنچانے کے بعد وہ ہر فرد کو اس کی انفرادی حیثیت کے مطابق، اور ہر گروہ اور قوم کو اس کی اجتماعی حیثیت کے مطابق، سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے کافی وقت دیتا ہے، یہ مہلت کا زمانہ بسا اوقات صدیوں تک دراز ہوتا ہے اور اس بات کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو کتنی مہلت ملنی چاہیے۔ پھر جب وہ مہلت، جو سراسر انصاف کے ساتھ اس کے لیے رکھی گئی تھی، پوری ہو جاتی ہے اور وہ اپنی باغیانہ روش سے باز نہیں آتا، تب اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ یہ فیصلے کا وقت اللہ کی مقرر کی ہوئی مدت سے نہ ایک گھڑی پہلے آسکتا ہے اور نہ وقت آجانے کے بعد ایک لمحہ کے لیے ٹل سکتا ہے۔

حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے! پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو، جو کچھ تم کماتے رہے ہو اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے؟!

پھر پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو "میرے رب کی قسم یہ بالکل سچ ہے اور
ع٥ تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو"۔ اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے، روئے زمین کی دولت بھی ہو تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتائیں گے۔[51] مگر ان کے درمیان پورے انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا، کوئی ظلم ان پر نہ ہوگا۔ سنو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ سن رکھو! اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر انسان جانتے نہیں ہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔

لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ اے نبی کہو کہ "یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی، اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے، یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنھیں لوگ سمیٹ رہے ہیں۔" اے نبی ان سے کہو "تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق[52]

---

[51] جس چیز کو عمر بھر جھٹلاتے رہے، جسے جھوٹ سمجھ کر ساری زندگی غلط کاموں میں کھپا گئے اور جس کی خبر دینے والے پیغمبروں کو طرح طرح کے الزام دیتے رہے، وہی چیز جب ان کی توقعات کے بالکل خلاف اچانک سامنے آکھڑی ہوگی تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے گی۔ ان کا ضمیر انھیں خود بتا دے گا کہ جب حقیقت یہ تھی تو جو کچھ وہ دنیا میں کر کے آئے ہیں اُن کا انجام اب کیا ہونا ہے۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ زبانیں بند ہوں گی اور ندامت و حسرت سے دل اندر ہی اندر بیٹھے جا رہے ہوں گے۔ جس شخص نے قیاس و گمان کے سودے پر اپنی ساری پونجی لگا دی ہو اور کسی خیر خواہ کی بات مان کر نہ دی ہو، وہ دیوالہ نکلنے کے بعد خود اپنے سوا اور کس کی شکایت کر سکتا ہے۔

[52] اردو زبان میں رزق کا اطلاق صرف کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہاں گرفت صرف اس قانون سازی پر کی گئی ہے جو دسترخوان کی چھوٹی سی دنیا میں مذہبی اوہام یا رسم و رواج کی بنا پر

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

اللہ نے تمھارے لیے اتارا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھیرا لیا؟[1] ان سے پوچھو، اللہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) لوگوں نے کر ڈالی ہے۔ اس غلط فہمی میں جہلا اور عوام ہی نہیں علما تک مبتلا ہیں۔ حالانکہ عربی زبان میں رزق محض خوراک کے معنی تک محدود نہیں ہے بلکہ عطا، اور بخشش اور نصیب کے معنی میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دنیا میں انسان کو دیا ہے وہ سب اس کا رزق ہے۔ حتیٰ کہ اولاد تک رزق ہے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں بکثرت راویوں کے نام رزق اور رُزَیق اور رزق اللہ ملتے ہیں جن کے معنی تقریباً وہی ہیں جو اردو میں اللہ دیے کے معنی ہیں۔ مشہور دعا ہے اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ، یعنی ہم پر حق واضح کر اور ہمیں اس کے اتباع کی توفیق دے۔ محاورے میں بولا جاتا ہے رُزِقَ علماً، فلاں شخص کو علم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حاملہ کے پیٹ میں ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ پیدا ہونے والے کا رزق اور اس کی مدت عمر اور اس کا کام لکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں رزق سے مراد صرف وہ خوراک ہی نہیں ہے جو اس بچے کو آئندہ ملنے والی ہے بلکہ وہ سب کچھ ہے جو اسے دنیا میں دیا جائے گا۔ خود قرآن میں ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پس رزق کو محض دسترخوان کی سرحدوں تک محدود سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف اُن پابندیوں اور آزادیوں پر اعتراض ہے جو کھانے پینے کی چیزوں میں لوگوں نے بطور خود اختیار کر لی ہیں، سخت غلطی ہے، اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں ہے بلکہ اس کی بدولت خدا کے دین کی ایک بہت بڑی اصولی تعلیم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ یہ اسی غلطی کا تو نتیجہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کا معاملہ تو ایک دینی معاملہ سمجھا جاتا ہے، لیکن تمدن کے وسیع تر معاملات میں اگر یہ اصول طے کر لیا جائے کہ انسان خود اپنے لیے حدود مقرر کرنے کا حق رکھتا ہے، اور اسی بنا پر خدا اور اس کی کتاب سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کی جانے لگے، تو عامی تو درکنار، علمائے دین و مفتیان شرع متین اور مفسرین قرآن و شیوخ حدیث تک کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ چیز بھی دین سے اُسی طرح ٹکراتی ہے جس طرح ماکولات و مشروبات میں شریعت الٰہی سے بے نیاز ہو کر جائز و ناجائز کے حدود بطور خود مقرر کر لینا۔

---

[1] یعنی تمھیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ کتنا سخت باغیانہ جرم ہے جو تم کر رہے ہو۔ رزق اللہ کا ہے اور تم خود اللہ کے جو ہو، پھر یہ حق آخر تمھیں کہاں سے حاصل ہو گیا کہ اللہ کی املاک میں اپنے تصرف، استعمال اور انتفاع کے لیے خود حد بندیاں مقرر کرو؟ کوئی نوکر اگر یہ دعویٰ کرے کہ آقا کے مال میں اپنے تصرف اور اختیارات کی حدیں اسے خود مقرر کر لینے کا حق ہے اور اس
(باقی صفحہ ۱۷ پر)

نے تم کو اس کی اجازت دی تھی یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟[۱] جو لوگ اللہ پر یہ جھوٹا افترا باندھتے ہیں ان کا کیا گمان ہے کہ قیامت کے روز ان سے کیا معاملہ ہوگا؟ اللہ تو لوگوں پر مہربانی کی نظر رکھتا ہے مگر اکثر
۶۰ انسان ایسے ہیں جو شکر نہیں کرتے۔[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) معاملہ میں آقا کے کچھ بولنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تو اس کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ تمھارا اپنا ملازم اگر تمھارے گھر میں اور تمھارے گھر کی سب چیزوں میں اپنے عمل اور استعمال کے لیے اس آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے تو تم اس کے ساتھ کیا معاملہ کرو گے؟ ــــ اُس نوکر کا معاملہ تو دوسرا ہی ہے جو سرے سے یہی نہیں مانتا کہ وہ کسی کا نوکر ہے اور کوئی اس کا آقا بھی ہے اور یہ کسی اور کا مال ہے جو اس کے تصرف میں ہے۔ اُس بدمعاش غاصب کی پوزیشن یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ یہاں سوال اس نوکر کی پوزیشن کا ہے جو خود مان رہا ہے کہ وہ کسی کا نوکر ہے، اور یہ بھی مانتا ہے کہ مال اُسی کا ہے جس کا وہ نوکر ہے، اور پھر کہتا ہے کہ اس مال میں اپنے تصرف کے حدود مقرر کر لینے کا حق مجھے آپ ہی حاصل ہے اور آقا سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] یعنی تمھاری یہ پوزیشن صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی تھی کہ آقا نے خود تم کو مجاز کر دیا ہوتا کہ میرے مال میں تم جس طرح چاہو تصرف کرو، اپنے عمل اور استعمال کے لیے حدود، قوانین، ضوابط بنانے کے جملہ حقوق میں نے تمھیں سونپے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا تمھارے پاس واقعی اس کی کوئی سند ہے کہ آقا نے تم کو یہ اختیارات دے دیے ہیں، یا تم بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ وہ تمام حقوق تمھیں سونپ چکا ہے؟ اگر پہلی صورت ہے تو براہ کرم وہ سند دکھاؤ، ورنہ بصورت دیگر یہ کھلی بات ہے کہ تم بغاوت پر جھوٹ اور افترا پردازی کا مزید جرم کر رہے ہو۔

[۲] یعنی یہ تو آقا کی کمال درجہ مہربانی ہے کہ وہ نوکر کو خود بتاتا ہے کہ میرے گھر میں اور میرے مال میں اور خود اپنے نفس میں تو کونسا طرز عمل اختیار کرے گا تو میری خوشنودی اور انعام اور ترقی سے سرفراز ہوگا، اور کس طریق کار سے میرے غضب اور سزا اور تنزل کا مستوجب ہوگا۔ مگر بہت سے بیوقوف نوکر ایسے ہیں جو اس عنایت کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ گویا ان کے نزدیک ہونا یہ چاہیے تھا کہ آقا ان کو بس اپنے گھر میں لا کر چھوڑ دیتا اور سب مال ان کے اختیار میں دے دینے کے بعد چھپ کر دیکھتا رہتا کہ کونسا نوکر کیا کرتا ہے، پھر جو بھی اس کی مرضی کے خلاف ــــ جس کا کسی نوکر کو علم نہیں ــــ کوئی کام کرتا تو اُسے وہ سزا دے ڈالتا۔ حالانکہ اگر آقا نے اپنے نوکروں کو اتنے سخت امتحان میں ڈالا ہوتا تو ان میں سے کسی کا بھی سزا سے بچ جانا ممکن نہ تھا۔

اے نبی! تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو، اور لوگو! تم بھی جو کچھ کر رہے ہو اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، نہ چھوٹی نہ بڑی، جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔[1] سنو! جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے، اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔ اے نبی! جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں، عزت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے، اور وہ سننے اور جاننے والا خدا ہے۔

آگاہ رہو! آسمان کے بسنے والے ہوں یا زمین کے، سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں، اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ (اپنے خود ساختہ) شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم و گمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (کھلے کانوں سے پیغمبر کی دعوت کو) سنتے ہیں۔[2]

[1] یہاں اس بات کا ذکر کرنے سے مقصود نبی کو تسکین دینا اور نبی کے مخالفین کو متنبہ کرنا ہے۔ ایک طرف نبی سے ارشاد ہو رہا ہے کہ پیغام حق کی تبلیغ اور خلق اللہ کی اصلاح میں جس تندہی و جانفشانی اور جس صبر و تحمل سے تم کام کر رہے ہو وہ ہماری نظر میں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس پُرخطر کام پر مامور کر کے ہم نے تم کو تمھارے حال پر چھوڑ دیا ہو، بلکہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ تمھارے ساتھ ہو رہا ہے اُس سے بھی ہم بے خبر نہیں ہیں۔ دوسری طرف نبی کے مخالفین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ ایک داعی حق اور خیر خواہ خلق کی اصلاحی کوششوں میں روڑے اٹکا کر تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ کوئی تمھاری ان حرکتوں کو دیکھنے والا نہیں ہے اور کبھی تمھارے ان کرتوتوں کی باز پرس نہ ہوگی۔ خبردار رہو، وہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو، خدا کے دفتر میں ثبت ہو رہا ہے۔

[2] یہاں ایک بہت بڑا مضمون چند مختصر لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ فلسفیانہ تجسس، جس کا مقصد یہ پتہ چلانا ہے کہ اس کائنات میں بظاہر جو کچھ ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اس کے پیچھے کوئی حقیقت پوشیدہ ہے یا نہیں اور

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) ہے تو وہ کیا ہے، دنیا میں اُن سب لوگوں کے لیے، جو وحی و الہام سے براہِ راست حقیقت کا علم نہیں پاتے، مذہب کے متعلق رائے قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ کوئی شخص بھی، خواہ وہ دہریت اختیار کرے یا شرک یا خدا پرستی، بہرحال ایک نہ ایک طرح کا فلسفیانہ تجسس کیے بغیر مذہب کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور پیغمبروں نے جو مذہب پیش کیا ہے اُس کی جانچ بھی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنی بساط بھر فلسفیانہ غور و فکر کر کے یہ اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرے کہ پیغمبر ہمیں مظاہرِ کائنات کے پیچھے جس حقیقت کے مستور ہونے کا پتہ دے رہے ہیں وہ دل کو لگتی ہے یا نہیں۔ اس تجسس کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار طریقِ تجسس پر ہے جس کے غلط ہونے سے غلط رائے اور صحیح ہونے سے صحیح رائے قائم ہوتی ہے۔ مشرکین نے خالص وہم پر اپنی تلاش کی بنیاد رکھی۔ اشراقیوں اور جوگیوں نے اگرچہ مراقبہ کا ڈھونگ رچایا اور دعویٰ کیا کہ ہم ظاہر کے پیچھے جھانک کر باطن کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، لیکن فی الواقع انھوں نے اپنی اس سراغ رسانی کی بنا گمان پر رکھی ہے۔ وہ مراقبہ دراصل اپنے گمان کا کرتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں نظر آتا ہے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ گمان سے جو خیال انھوں نے قائم کر لیا ہے اسی پر تخیل کو جما دینے اور پھر اس پر ذہن کا دباؤ ڈالنے سے ان کو وہی خیال چلتا پھرتا نظر آنے لگتا ہے۔ اصطلاحی فلسفیوں نے قیاس کو بنائے تحقیق بنایا جو اصل میں تو گمان ہی ہے لیکن اس گمان کے لنگڑے پن کو محسوس کر کے انھوں نے منطقی استدلال اور مصنوعی تعقل کی بیساکھیوں پر اُسے چلانے کی کوشش کی ہے اور اس کا نام "قیاس" رکھ دیا ہے۔ سائنس دانوں نے اگرچہ سائنس کے دائرے میں تحقیقات کے لیے علمی طریقہ اختیار کیا، مگر مابعد الطبیعیات کے حدود میں قدم رکھتے ہی وہ بھی علمی طریقہ کو چھوڑ کر قیاس و گمان اور اندازہ و تخمینہ کے پیچھے چل پڑے۔ پھر ان سب گروہوں کے اوہام اور گمانوں کو کسی نہ کسی طرح تعصب کی بیماری بھی لگ گئی جس نے انھیں دوسرے کی بات نہ سننے اور اپنی ہی محبوب راہ پر مڑنے اور مڑ جانے کے بعد مڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔

قرآن اس طریقِ تجسس کو بنیادی طور پر غلط قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے کہ تم تلاشِ حقیقت کی بنا گمان اور قیاس آرائی پر رکھتے ہو اور پھر تعصب کی وجہ سے کسی کی معقول بات سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ اسی دوہری غلطی کا نتیجہ یہ ہے کہ تمھارے لیے خود حقیقت کو پا لینا تو ناممکن تھا ہی، انبیاء کے پیش کردہ دین کو جانچ کر صحیح رائے پر پہنچنا بھی غیر ممکن ہو گیا۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) اس کے مقابلہ میں قرآن فلسفیانہ تحقیق کے لیے صحیح علمی و عقلی طریقہ یہ بتاتا ہے کہ پہلے تم حقیقت کے متعلق اُن لوگوں کا بیان کھلے کانوں سے، بلا تعصب سنو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قیاس و گمان یا مراقبہ و استدراج کی بنا پر نہیں بلکہ "علم" کی بنا پر تمہیں بتا رہے ہیں کہ حقیقت یہ ہے۔ پھر کائنات میں جو آثار (باصطلاح قرآن نشانات) تمہارے مشاہدے اور تجربے میں آتے ہیں ان پر غور کرو، ان کی شہادتوں کو مرتب کر کے دیکھو، اور تلاش کرتے چلے جاؤ کہ اس ظاہر کے پیچھے جس حقیقت کی نشاندہی کی جا رہی ہے اُس کی طرف اشارہ کرنے والی علامات تم کو اسی ظاہر میں ملتی ہیں یا نہیں۔ اگر ایسی علامات نظر آئیں اور ان کے اشارے بھی واضح ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم خواہ مخواہ ان لوگوں کو جھٹلاؤ جن کا بیان آثار کی شہادتوں کے مطابق پایا جا رہا ہے ——— یہی طریقہ فلسفۂ اسلام کی بنیاد ہے جسے چھوڑ کر افسوس ہے کہ مسلمان فلاسفہ افلاطون و ارسطو کے نقش قدم پر چل پڑے۔

قرآن میں جگہ جگہ نہ صرف اس طریق کی تلقین کی گئی ہے، بلکہ خود آثار کائنات کو پیش کر کر کے ان سے نتیجہ نکالنے اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی گویا باقاعدہ تربیت دی گئی ہے تاکہ سوچنے اور تلاش کرنے کا یہ ڈھنگ ذہنوں میں راسخ ہو جائے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی مثال کے طور پر صرف دو آثار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یعنی رات اور دن۔ یہ انقلاب لیل و نہار سورج اور زمین کی نسبتوں میں انتہائی باضابطہ تغیر سے رونما ہوتا ہے، جو ایک عالمگیر ناظم اور ساری کائنات پر غالب اقتدار رکھنے والے ناظم کے وجود کی صریح علامت ہے۔ اس میں صریح حکمت اور مقصدیت بھی نظر آتی ہے کیونکہ تمام موجودات زمین کی بے شمار مصلحتیں اسی گردش لیل و نہار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس میں صریح ربوبیت اور رحمت اور پروردگاری کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں کیونکہ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ جس نے زمین پر یہ موجودات پیدا کی ہیں وہ خود ہی ان کے وجود کی ضروریات بھی فراہم کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر ناظم ایک ہے، اور یہ بھی کہ وہ کھلنڈرا نہیں بلکہ حکیم ہے اور با مقصد کام کرتا ہے، اور یہ بھی کہ وہی محسن و مربی ہونے کی حیثیت سے عبادت کا مستحق ہے، اور یہ بھی کہ گردش لیل و نہار کے تحت جو بھی ہے وہ رب نہیں مربوب ہے، آقا نہیں غلام ہے۔ ان آثار کی شہادتوں کے مقابلہ میں مشرکین نے گمان و قیاس سے جو مذہب ایجاد کیے ہیں وہ آخر کس طرح صحیح ہو سکتے ہیں۔

لوگوں نے کہدیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا[1] ہے۔ سبحان اللہ![2] وہ تو بے نیاز ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی ملک[3] ہے۔ تمہارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا

---

[1] اوپر کی آیات میں لوگوں کی اس جاہلیت پر ٹوکا گیا تھا کہ اپنے مذہب کی بنا علم کے بجائے قیاس و گمان پر رکھتے ہیں اور پھر کسی علمی طریقہ سے یہ تحقیق کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ ہم جس مذہب پر چلے جا رہے ہیں اس کی صحت پر کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں۔ اب اسی سلسلہ میں عیسائیوں اور بعض دوسرے اہل مذاہب کی اس نادانی پر ٹوکا گیا ہے کہ انھوں نے محض گمان سے کسی کو خدا کا بیٹا ٹھیرا لیا۔

[2] سبحان اللہ کلمۂ تعجب کے طور پر کبھی اظہار حیرت کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اور کبھی اس کے واقعی معنی ہی مراد ہوتے ہیں یعنی یہ کہ "اللہ تعالیٰ ہر عیب سے منزہ ہے"۔ یہاں یہ کلمہ دونوں معنی دے رہا ہے۔ ان لوگوں کے اس قول پر اظہار حیرت بھی مقصود ہے اور ان کی بات کے جواب میں یہ کہنا بھی مقصود ہے کہ اللہ تو بے عیب ہے، اس کی طرف بیٹے کی نسبت کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔

[3] یہاں اُن کے اس قول کی تردید میں تین باتیں کہی گئی ہیں: ایک یہ کہ اللہ بے عیب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بے نیاز ہے۔ تیسرے یہ کہ آسمان و زمین کی ساری موجودات اُس کی ملک ہیں۔ یہ مختصر جوابات تھوڑی سی تشریح سے بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ بیٹا یا تو صُلبی ہو سکتا ہے یا متبنّیٰ۔ اگر یہ لوگ کسی کو خدا کا بیٹا صُلبی معنوں میں قرار دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو اُس حیوان پر قیاس کرتے ہیں جو شخصی حیثیت سے فانی ہوتا ہے اور جس کے وجود کا تسلسل بغیر اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ اس کی کوئی جنس ہو اور اس جنس سے کوئی اس کا جوڑا ہو اور ان دونوں کے صنفی تعلق سے اس کی اولاد ہو جس کے ذریعہ سے اس کا حیوانی وجود اور اس کا کام باقی رہے۔ اور اگر یہ لوگ اس معنی میں خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں کہ اس نے کسی کو متبنّیٰ بنایا ہے تو یہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو انھوں نے خدا کو اس انسان پر قیاس کیا ہے جو لاولد ہونے کی وجہ سے اپنی جنس کے کسی فرد کو اس لیے بیٹا بناتا ہے کہ وہ اس کا وارث ہو اور اُس نقصان کی، جو اسے بے اولاد رہ جانے کی وجہ سے پہنچ رہا ہے، بڑائے نام ہی سہی، کچھ تو تلافی کر دے۔ یا پھر ان کا گمان یہ ہے کہ خدا بھی انسان

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں؟ اے محمد! کہدو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے کر لیں، پھر ہماری طرف ان کو پلٹنا ہے پھر ہم اس کفر کے بدلے ان کو سخت سزا کا مزہ چکھائیں گے ؏

ان کو نوحؑ کا قصہ سناؤ، اُس وقت کا قصہ جب اُس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے برادران قوم! اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور ...

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) کی طرح جذباتی میلانات رکھتا ہے اور اپنے بے شمار بندوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کو کچھ ایسی محبت ہو گئی ہے کہ اس نے اسے بیٹا بنا لیا ہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، بہرحال اس عقیدے کے بنیادی تصورات میں خدا پر بہت سے عیوب، بہت سی کمزوریوں، بہت سے نقائص اور بہت سی احتیاجوں کی تہمت لگی ہوئی ہے اسی بنا پر پہلے فقرے میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب، نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جو تم اُس کی طرف منسوب کر رہے ہو، اور دوسرے فقرے میں ارشاد ہوا کہ وہ ان حاجتوں سے بھی بے نیاز ہے جن کی وجہ سے فانی انسانوں کو اولاد کی یا بیٹا بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور تیسرے فقرے میں صاف کہدیا گیا کہ زمین و آسمان میں سب اللہ کے بندے اور اس کے مملوک ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اللہ کا ایسا کوئی مخصوص ذاتی تعلق نہیں ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسے وہ اپنا بیٹا یا اکلوتا یا ولی عہد قرار دے لے۔ صفات کی بنا پر بے شک اللہ بعض بندوں کو بعض کی بہ نسبت زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ مگر اس محبت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بندگی کے مقام سے اٹھا کر خدائی میں شرکت کا مقام دے دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اس محبت کا تقاضا بس وہ ہے جو اس سے پہلے کی ایک آیت میں بیان کر دیا گیا ہے کہ "جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔"

(حاشیہ صفحہ ہذا) لے یہاں تک تو ان لوگوں کو معقول دلائل اور دل کو لگنے والے نصائح کے ساتھ سمجھایا گیا تھا کہ ان کے عقائد اور خیالات اور طریقوں میں غلطی کیا ہے اور وہ کیوں غلط ہے اور اس کے مقابلہ میں صحیح راہ کیا ہے اور وہ کیوں صحیح ہے۔ اب اُن کے اُس طرز عمل کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے جو وہ

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

کی آیات سنا سنا کر تمھیں غفلت سے بیدار کرنا تمھارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے، تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور جو منصوبہ تمھارے پیش نظر ہو اس کو خوب سوچ سمجھ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمھاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے، پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔[۵۱] تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلبگار نہ تھا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں" ـــــ انھوں نے اسے جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے، بچا لیا اور انہی کو زمین میں باقی رکھا اور ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ پس دیکھ لو کہ جنھیں متنبہ کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) اس سیدھی سیدھی اور صاف صاف تفہیم و تلقین کے جواب میں اختیار کر رہے تھے۔ دس گیارہ سال سے ان کی روش یہ تھی کہ اس معقول تنقید اور صحیح رہنمائی پر غور کرنے کے بجائے اس کے کہ اپنی گمراہیوں پر نظر ثانی کرتے وہ الٹے اس شخص کی جان کے دشمن ہو گئے تھے جو ان باتوں کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ انہی کے بھلے کے لیے پیش کر رہا تھا۔ وہ دلیلوں کا جواب پتھروں سے اور نصیحتوں کا جواب گالیوں سے دے رہے تھے۔ اپنی بستی میں ایسے شخص کا وجود ان کے لیے سخت ناگوار بلکہ ناقابل برداشت ہو گیا تھا جو غلط کو غلط کہنے والا ہو اور صحیح بات بتانے کی کوشش کرتا ہو۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم اندھوں کے درمیان جو آنکھوں والا پایا جاتا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے بجائے اپنی آنکھیں بھی بند کر لے، ورنہ ہم زبردستی اس کی آنکھیں پھوڑ دیں گے تاکہ بینائی جیسی چیز ہماری سرزمین پر نہ پائی جائے۔ یہ طرز عمل جو انھوں نے اختیار کر رکھا تھا، اس پر کچھ اور فرمانے کے بجائے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ انھیں نوح کا قصہ سنا دو، اسی قصے میں وہ اپنے اور تمھارے معاملہ کا جواب بھی پالیں گے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۱؎ یعنی چیلنج ہے کہ میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا، تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو، میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔

گیا تھا (اور پھر بھی انھوں نے مان کر نہ دیا) اُن کا کیا انجام ہوا۔

پھر نوح کے بعد ہم نے مختلف پیغمبروں کو اُن کی قوموں کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ مگر جس چیز کو انھوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا اسے پھر مان کر نہ دیا۔ اس طرح ہم حد سے گذر جانے والوں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔[لہ]

لہ حد سے گذر جانے والے لوگ وہ ہیں جو ایک مرتبہ غلطی کر جانے کے بعد پھر اپنی بات کی پیچ اور ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی اُسی غلطی پر اڑے رہتے ہیں۔ اور جس بات کو ماننے سے ایک دفعہ انکار کر چکے ہیں اسے پھر کسی فہمائش، کسی تلقین اور کسی معقول دلیل سے بھی مان کر نہیں دیتے۔ ایسے لوگوں پر آخر کار خدا کی ایسی پھٹکار پڑتی ہے کہ انھیں پھر کبھی راہ راست پر آنے کی توفیق نہیں ملتی۔

جماعت اسلامی کا دوسرا اجتماع عام

بمقام موضع ہرواره متصل شہر الہ آباد (یو۔پی)

بتاریخ ۵، ۶، ۷ اپریل ۴۶ء

ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعت میں اور اخبار کوثر لاہور میں اجتماع مذکور کا مفصل اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلے میں مزید ہدایات یہ ہیں:

(۱) ہرواره ریلوے اسٹیشن نہیں ہے اس لیے ٹکٹ الہ آباد کے لیے جائیں۔

(۲) الہ آباد میں امسال بارش کی وجہ سے ابھی کافی سردی ہے اس لیے احباب بستر میں کمبل ضرور لے کر آئیں۔

(۳) چونکہ باوجود کوشش کے راشن کا کوئی انتظام نہ ہو سکا اس لیے تمام شرکاء اجتماع اپنے ساتھ کم سے کم دو سیر آٹا یا چاول اور ایک پاؤ شکر لیکر آئیں۔

(۴) گذشتہ مفصل اعلان میں لاہور سے الہ آباد تک یکجا سفر کے انتظام کا ذکر کیا گیا تھا اور اس قافلہ میں شریک ہونے والوں کو مرکز میں کرایہ جمع کرا دینے کی بھی ہدایت کی گئی تھی لیکن ہم کوئی بوگیاں (گاڑی کے ڈبے) ریزرو کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے اس لیے یکجائی سفر کی تجویز منسوخ کر دی گئی ہے۔ اب احباب اپنے طور پر سفر کا انتظام کریں اور مرکز میں کرایہ نہ بھیجیں۔

خاکسار

طفیل محمد۔ قیم جماعت اسلامی، دار الاسلام۔ پٹھان کوٹ (پنجاب)

مقتضیاتِ ایمان

(۳)

ایمانیات خمسہ اور ان کی ضروری تشریح

از جناب مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری

۲۔ ایمان بالملائکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد اس کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے اور یہ اس حیثیت سے لازمی قرار دیا جاتا ہے کہ توحید الٰہی کی پوری حقیقت واضح ہونے کے لیے ان تمام رخنوں کو بند کر دینا ضروری ہے جہاں جہاں سے مخلوق پرستی کے آغاز کا خطرہ ہے اور غیر اللہ کی بندگی و غلامی اور شرک یا اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ موجبات کے شروع ہونے کا ذرہ بھر بھی امکان ہے مافوق الطبیعت روحانی اور غیر مرئی مخلوقات کے تصور سے۔ انسانی ذہن میں حس و عقل سے ماوراء چیزوں کے متعلق غیر معمولی عقیدت مندی کے جذبات کسی نہ کسی شکل و صورت میں خواہ مخواہ ابھر ہی جاتے ہیں اور بسا اوقات دلوں اور دماغوں میں اس قدر راسخ ہو کر جم جاتے ہیں کہ انسانی زندگی کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے اور ان کی وجہ سے اوہام و خرافات کا عجیب و غریب غیر متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پھر عملی گوشوں میں بھی اس کے نمونے نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ جن جن مختلف قوموں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے ہیں ان سب میں جاہلیت نے اس راستہ سے بھی نفوذ کیا ہے ان میں فرشتوں کے وجود کا اقرار تو موجود رہا مگر علم حقیقت سے دور ہو جانے کے باعث جہالت و غفلت اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں نے ان کو گمراہی میں مبتلا کر دیا اور انھوں نے فرشتوں کو اللہ کے شریک اور اس کی اولاد تک قرار دے لیا۔ اسی لیے قرآن عزیز نے پوری شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ فرشتوں کے متعلق تصریح کر دی ہے جس سے ایک طرف ان کا وجود ثابت ہوتا ہے

تو دوسری طرف کائنات میں ان کا صحیح موقف اور خصوصاً انسان کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت بھی متعین ہو جاتی ہیں۔

فرشتوں کی خصوصیات قرآن عزیز نے فرشتوں کی حقیقت و ماہیت سے گفتگو کرنے کے بجائے ان کی ہستی کا اثبات کرتے ہوئے ان کے وجود پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے اور ان پر اس حیثیت سے روشنی ڈالی ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی شخصیت رکھنے والی مخلوق ہیں، ان کے اوصاف، خصوصیات اور لوازم ہیں، ان کی خدمات، فرائض اور واجبات ہیں، نہ مجرد قوتیں یا ارواح لطیفہ ہیں اور نہ خدائی کے شریک و مددگار ہیں۔ پس جو "تجدد پسند" حضرات انھیں تشخص کے اعتبار سے نہیں مانتے وہ دراصل اسلامی عقائد سے صریح انحراف کر رہے ہیں اور قرآن کے حقائق سے دور جا پڑے ہیں۔ لہذا ہم قرآنی شواہد ہی سے بتائے دیتے ہیں کہ فرشتے کون ہیں، ان کے کام کیا ہیں، ان کا مان لینا کیوں ضروری ہے، انکار سے کیا لازم آئے گا۔

قرآن کے مطالعہ کرنے سے ملائکہ کے متعلق سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ مجموعی کائنات ہی کی طرح اللہ تعالیٰ کے مخلوق، مربوب اور محکوم ہیں، علم و ارادہ اور اختیار سے صرف اسی حد تک متصف کیے گئے ہیں کہ ان سے متعلق جو فرائض ہیں انھیں انجام دے سکیں۔ چنانچہ فرمایا جاتا ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ. لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ

(سورۂ انبیاء - ۲)

(بات وہ نہیں ہے جو منکرین دعوت حق کہتے ہیں) بلکہ فرشتے وہ بزرگ بندے ہیں جو اللہ کے سامنے بات کرنے میں سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

اور پھر ان کی عبودیت و بندگی کے عالم کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ:

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ

فرشتے اللہ کی عبادت سے متکبرانہ انحراف نہیں کرتے اور نہ اس کی بندگی سے جی چراتے ہیں، وہ رات دن تسبیح میں لگے رہتے ہیں سستی نہیں کرتے۔

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (سورہ تحریم - ۲)	جو کچھ بھی اللہ نے انھیں امر فرمادیا ہے، وہ اس میں کبھی نافرمانی نہیں کرتے، اور جس پر وہ مامور ہیں، کیے چلے جارہے ہیں۔

ایک اور جگہ یہ فرمانے کے بعد کہ علوی و سفلی تمام مخلوقات اور فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے آگے سربسجود ہیں، فرمایا کہ فرشتوں کی خاص کیفیت کیا ہے۔

وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ، يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ	اور وہ کسی طرح کا تکبر نہیں کرتے، اپنے رب سے جوان پر بالادست ہے ڈرتے ہیں اور جو حکم دیا جاتا ہے بجالاتے ہیں۔

اور یہ بھی فرمادیا ہے کہ ہر حال میں وہ اندیشہ ناک رہتے ہیں۔

يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ (سورہ رعد - ۲)	بجلی کی گرج اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے بھی اللہ کے خوف سے اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

اور فرمایا ہے کہ:

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (نازعات - ۱)	پھر کام کی تدبیر کرنے والے فرشتوں کی قسم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اپنے قانون قضا کی تدبیر تو خود ہی فرمارہا ہے مگر اس کے اذن و مشیت کے تحت اس کے فرامین کی تکوینی تدبیر فرشتوں کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ نظام عالم جن کارکنوں کے ذریعہ سے چل رہا ہے وہ دو قسم پر مشتمل ہیں۔ ایک ظاہری کارکن، مثلاً ہوا، گرمی، سردی وغیرہ جنھیں ہم محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے باطنی کارکن جو ہم سے پوشیدہ ہیں، اور وہی فرشتے ہیں۔

پھر ان آیات مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ عالم موجودات میں ملائکہ کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ وہ خود مختاری نہیں رکھتے، ساری مخلوقات ہی کی طرح بندگیٔ رب میں لگے ہوئے ہیں، اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح بجالارہے ہیں، برابر انہماک کے ساتھ ان کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ اللہ کے معزز بندے ہیں، بارگاہ خداوندی میں خود پیش قدمی کرکے کوئی بات نہیں کرتے۔ بس حکم بجالانے میں لگے رہتے ہیں، اللہ کی خشیت و جلال سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں، جن جن تکوینی امور پر ان کو مامور کردیا گیا ہے انھیں جوں کا توں ادا کرتے ہیں، ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے وظیفۂ حیات سے غافل نہیں

ہوتے۔ اللہ کی حمد و ثنا اور اس کی تسبیح و تقدیس ان کا دائمی مشغلہ ہے۔ کسی وقت اس کی عبادت سے نہ اکتاتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں اور نہ اس کی بندگی سے کبھی سرتابی کرتے ہیں۔

فرشتوں کے ان تمام اوصاف نے مشرکوں کے غلط تصورات اور مشرکانہ اوہام وخرافات کی جڑ ہی کاٹ دی اور بتادیا کہ وہ خدائی میں شریک تو کیا ہوتے وہ تو بندگی میں انسان سے بھی زیادہ مجبور و مقہور ہیں۔

اس سب سے بڑی غلط فہمی کو جو فرشتوں کی قوتوں کے متعلق پیدا ہوسکتی تھی، رفع کر دینے کے بعد قرآن عزیز نے غیر مشتبہ لفظوں میں فرشتوں اور انسان کی اضافی حیثیت کو بھی بتادیا ہے کہ انسانی حقیقت ملائکہ سے بڑھی ہوئی ہے۔ انسانی تخلیق کی غرض و غایت وہ ہے جو ان سے کسی طرح بھی پوری نہ ہوسکتی تھی۔ اسی لیے انسان کے مستقل وجود کی مشیت الٰہی مقتضی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت و نیابت کا جلیل القدر اور شاندار منصب فرشتوں کے بجائے انسان کو عطا فرمایا۔ چنانچہ قرآن میں جہاں حضرت آدم کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا گیا ہے وہاں فرشتوں کے متعلق بتایا ہے کہ انھوں نے حکم الٰہی کے بموجب حضرت آدم کو سجدہ کیا۔ پھر کس طرح وہ اس لائق ہوسکتے ہیں کہ اولاد آدم ان کے آگے سر جھکائے۔

فرشتوں کے ذریعہ نصرت ربانی فرشتے اہل زمین کے لیے سفارش کرتے ہیں، مگر اس معنی میں نہیں کہ جو ان کے نام کی نیاز چڑھائے اس کے لیے وہ خدا کے دربار میں آکر بیٹھ جائیں کہ ہمارے فلاں متوسل کا کام کر دیا جائے، بلکہ صرف اس معنی میں کہ اہل زمین کے کرتوتوں پر جب اللہ ناراض ہوتا ہے تو وہ درخواست کرتے ہیں کہ ذرا ان سے درگذر کیا جائے اور انھیں کچھ مزید مہلت دے دی جائے:

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَن فِي الْأَرْضِ — اور فرشتے اہل زمین کے حق میں استغفار کرتے ہیں۔

اسی طرح فرشتے مومنین کے لیے بھی سفارش کرتے ہیں، مگر وہ بھی دعا کی حیثیت سے، جیسا کہ فرمایا:

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا — اور فرشتے ان لوگوں کے لیے مغفرت مانگتے ہیں جو ایمان لاچکے ہیں

پھر جو اہل ایمان اللہ کی ربوبیت کا اقرار و اعتراف کرکے اس پر ثابت قدم ہوجاتے ہیں ان کو

اطمینانِ قلب بخشنے کے لیے رحمت کے فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ، نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (حم سجدہ۔۴)

یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب تو اللہ ہی ہے اور اس پر استقامت کے ساتھ جمے رہے اُن پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ خوف کرو اور نہ غم، اور اس جنت پر خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، ہم دنیا و آخرت میں تمھارے رفیق ہیں۔

اور جو مخلص اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کے راستے میں عزیمت کے ساتھ مجاہدانہ اقدامِ عمل کرتے ہیں، ان کے لیے بارگاہِ خداوندی سے فرشتوں کو خاص طور پر حکم دیا جاتا ہے۔

فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (انفال۔۲)

پس (دشمنانِ حق کے مقابلہ میں) ان لوگوں کو ثابت قدم رکھو جو ایمان لائے ہیں۔

اسلام کی تحریک کا سرزمینِ عرب میں پہلا اور زبردست عسکری معرکہ میدانِ بدر کا واقعہ ہے جس میں اسلام و کفر، حق و باطل اور نور و ظلمت کی کشمکش تھی۔ مادی ساز و سامان کے اعتبار سے دونوں طاقتوں کا مقابلہ بالکل نامساوی تھا۔ جنگی آلات و اسباب جو کچھ بھی تھے محض برائے نام تھے مومنین مخلصین کے ایک مٹھی بھر گروہ نے اپنی ساری طاقتیں اور ظاہری و باطنی کوششیں جو کچھ اور جتنی کچھ اس کے امکان میں تھیں، پوری رضا و رغبت کے ساتھ حق کے لیے لگا دی تھیں اور اب صرف اللہ تعالےٰ کی غیبی نصرت اور غیر مادی تائید و حمایت ہی کا وسیلہ باقی رہ گیا تھا۔ عین اس وقت اللہ کی رحمت کا ظہور فرشتوں کے ذریعہ ہوا اور یوں دستگیری فرمائی گئی:

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُرْدِفِیْنَ (انفال۔۱)

(یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری فریاد سن لی اور فرمایا کہ میں تمھاری مدد ایک ہزار رکاب فرشتوں سے کر رہا ہوں

اسی طرح غزوہ احد میں اہلِ ایمان سے اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر اہلِ باطل کے مقابلہ میں

تم نے صبر و تقویٰ کے ساتھ استقامت دکھلائی تو پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری امداد کی جائے گی۔

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ
أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ
مُنْزَلِينَ بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ
مِنْ فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ
آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ وَمَا جَعَلَهُ
اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ
بِهِ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (آل عمران)

(یاد کرو) جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لیے یہ کافی نہ ہوگا کہ تمھارا رب تین ہزار نازل کردہ فرشتوں سے تمھاری امداد فرمائے۔ کیوں نہیں، اگر تم نے صبر اور تقویٰ اختیار کیے رکھا اور وہ دشمن تم پر اچانک ٹوٹ پڑے تو تمھارا رب علامت والے پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری امداد فرمائے گا اور اس کو تو اللہ نے تمھارے لیے خوشخبری بنا دیا تاکہ تمھارے دل اس پر مطمئن ہوجائیں، اور نصرت تو اللہ ہی کے پاس سے ہے

یہی حال غزوۂ احزاب میں بھی تھا کہ بے سروسامانی کا عالم تھا، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ہر طرح کا اضطراب سراسیمگی، حیرانی و پریشانی تھی، عرب کی تمام باطل پرست طاقتیں اپنے آپس کے اختلافات کے باوجود اسلام اور پیغمبر اسلام اور ان کے مخلصین کو نیست و نابود کر دینے کے آخری عزم و ارادے کے ساتھ میدان میں نکل آئی تھیں، اور ادھر گھر کے بھیدی، مار آستین منافقین برابر اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشی فتنوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس دوطرفہ پریشانی کے ناسازگار ماحول اور ہیبت ناک فضا میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ نصرت فرمائی اور اس واقعۂ خاص کو اپنی ایک نعمت قرار دے کے اپنا احسان جتلایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا
نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ
فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ
تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا
(احزاب - ۲)

اے ایمان لانے والو! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہو چکی ہے۔ جبکہ (اہل باطل) کے لشکروں نے تم کو آگھیرا تو ہم نے ان پر ہوا اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور اللہ تمھاری ساری عملی کارروائیوں پر نظر رکھنے والا ہے۔

ان تمام مقامات کی تفصیل تشریحات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، ان کے یہاں نقل

کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بہرحال آیات مذکورہ کی روشنی میں بالکل واضح ہوگیا کہ فرشتوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت اور غیر مادی تائید کا بھی اہل ایمان کے حق میں ظہور ہوتا ہے۔ لہذا فرشتوں پر ایمان لانے کا ایک مدعا یہ بھی ہے کہ "مقتضیات ایمان" پر پوری طرح کاربند ہوجانے والے مخلصین کو یقین رہے کہ محسوس مادی وسائل ہی سب کچھ نہیں ہیں بلکہ اس ظاہر کے پیچھے ایک غیبی مخلوق بھی ہے جو اللہ کے حکم سے غیر محسوس طریقہ پر ان کی مدد کو آسکتی ہے۔ یہ مخلوق جس طرح امور تکوینی میں بحکم الٰہی کارفرما ہے اسی طرح امور تشریعی میں بھی کارکن ہے بشرطیکہ کام کرنے والے خالص اسوۂ انبیاء کرام پر کام کریں، تمام اپنی امکانی کوششوں کو اسی ایک مقصد پر مرکوز کردیں اور پورے خلوص نیت اور یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اس سعی پر لگادیں کہ اللہ کی زمین پر اس کی صحیح خلافت قائم ہو اور تمام باطل طاغوتوں کے علی الرغم دین حق کا غلبہ ہوجائے۔

فرشتوں کے ذریعہ لعنت ربانی جس طرح اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اپنی نصرت نازل فرماتا ہے اسی طرح فرشتوں کے ذریعہ اس کی لعنت بھی نازل ہوا کرتی ہے چنانچہ قرآن میں اس حقیقت کو پیش فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں صاف صاف بیان کی ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو دنیا سے چھپا دیتے ہیں، ان پر اللہ کی لعنت اور سب لعنت کرنے والوں کی لعنت اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ وہ اس سے توبہ اور اصلاح نہ کرلیں اور جن حقائق کو چھپا رکھا تھا انھیں بیان نہ کرنے لگیں۔ اس کے بعد پھر فرمایا ہے کہ جو اس کافرانہ رویہ پر زندہ رہتے اور اسی پر مرجاتے ہیں، ان پر انسان اور فرشتے دونوں لعنت کرتے رہتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ	بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور کافرانہ حالت
كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ	ہی میں مرگئے ان پر اللہ کی، اور فرشتوں کی اور تمام
الْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (بقرہ-۱۹)	لوگوں کی لعنت ہے۔

اور فرمایا کہ جن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ ان کے پاس بیّنات آچکی ہیں، اور رسول کے حق ہونے پر شہادت بھی دے چکے ہیں اور پھر "ایمان" کے بعد کفر کا رویہ اختیار کرکے "مقتضیات ایمان" سے صاف

کترا جاتے ہیں ان پر بھی فرشتوں کی لعنت ہوا کرتی ہے۔

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ خَالِدِينَ فِيهَا (آل عمران - ۹)

یہی وہ لوگ ہیں جن کی جزاء اللہ کی اور فرشتوں کی، اور تمام انسانوں کی، لعنت ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

فرشتوں کے ذریعہ انسانی اعمال کی نگرانی

اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کے ہر کام پر کڑی نگرانی ہوتی ہے اور اس کام کے لیے بھی فرشتے اس کے آگے پیچھے لگے رہتے ہیں چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

سَوَاءٌ مِّنكُم مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَن جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ

تم میں سے کوئی اپنی بات زور سے کہے یا آہستہ، اور جو کوئی رات کو چھپنے والا ہو یا دن کو نمایاں ہونے والا ہو اس کے لیے تعاقب کرنے والے ہیں جو امر الٰہی سے اس کی نگرانی آگے سے اور پیچھے سے کرتے رہتے ہیں۔

اور یہ انسانی افعال و اعمال کی نگرانی برابر موت تک ہوتی رہتی ہے:

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ (انعام - ۸)

اور اللہ تم پر نگرانی کرنے والے (فرشتے) روانہ فرماتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اس کو پورا پورا لے لیتے ہیں اور وہ کچھ بھی کمی نہیں کرتے۔

انسان اس دنیا کی زندگی میں جو کچھ بھی برا بھلا کرتا رہتا ہے اس کو اللہ کے حضور قیامت میں حساب کے لیے پیش کیا جاتا ہے، اسی لیے فرشتوں کو متعین کیا گیا ہے کہ وہ تمام انسانی حرکات و سکنات، اقوال و افعال کا ریکارڈ محفوظ رکھیں:

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ كِرَامًا كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ (انفطار - ۱)

اور حال یہ ہے کہ تم پر نگرانی کرنے والے معزز نویسندے مقرر ہیں، وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ — جو بھی کوئی بات منہ سے نکلتا ہے اس کے پاس ایک نگہبان حاضر رہتا ہے

فرشتوں کے ذریعہ رسولوں تک پیغام رسانی

خالق نے اپنے منشا کے مطابق عالم انسانی تک پیام پہنچانے کے لیے بھی فرشتوں ہی کو ذریعہ بنایا ہے۔ انہی کے توسط سے اس نے اپنے احکام و قوانین، بندگی کے آداب و قواعد اور نظام دینی و شرعی کی وحی روانہ فرمائی ہے اور وہی ہیں جو پیغام الٰہی کو انبیاء و رسل تک اپنے کسی تصرف کے بغیر بے کم و کاست پوری امانت داری و دیانت کے ساتھ پہنچاتے ہیں:

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (حج-۱) — اللہ فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے پیغام پہنچانے والے چن لیتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (فاطر-۱) — ہر طرح کی تعریف اللہ کیلیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنیوالا ہے اور فرشتوں کو قاصد بنانیوالا ہے جو دو دو تین تین چار چار بازوؤں والے ہیں وہ پیدائش میں جیسی چاہتا ہے زیادتی کرتا ہے۔ اللہ بے شک ہر چیز پر قادر ہے۔

اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِىَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (شوریٰ-۵) — یا اللہ کسی قاصد کو بھیج دیتا ہے پس وہ وحی کرتا ہے اللہ کے اذن سے جو وہ چاہتا ہے۔

عربی زبان میں "اَلُوْكَة" کے معنی ہی سفارت، پیغام رسانی اور ایلچی گری کے آتے ہیں۔ اسی سے لفظ "مَلَاك" نکلا ہے جس کی جمع "مَلٰٓئِكَة" آتی ہے۔ یہی معنی فرشتہ کے بھی ہیں جو "فرستادہ" سے نکلا ہے۔ اس نام سے خود ظاہر ہے کہ وہ فرشتے ہی ہیں جو اللہ کے پیغامات اس کے نبیوں کو پہنچانے کے لیے، اور ایمان لانے والوں کو راہ حق میں تکالیف و شدائد کے بہترین نتائج و ثمرات کی خوشخبری دینے کے لیے، اور حق و صداقت پر چلنے والوں کی تائید و نصرت کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو تمام آسمانی کتابوں اور الٰہی صحیفوں میں لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود پھر بھی کافی حد تک موجود ہیں اور قرآن کے بیان کردہ حقائق کی تائید و شہادت کے لیے الزامی طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

وحی الٰہی کے سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ جبریل کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنا، کبھی اپنی ملکوتی شکل میں نمودار ہونا اور کبھی انسانی پیکر میں ظہور کرنا قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ جبریل کے لیے شدید القویٰ (مضبوط قوتوں والا) رسول کریم (بزرگ فرستادہ)، روح القدس (ایک مقدس روح)، روح امین (امانتدار روح) کے الفاظ قرآن عزیز میں وارد ہوئے ہیں۔ ایک مقام پر اہل کتاب کی حماقتوں کو واضح فرماتے ہوئے کہ ان میں نبوت محمدی اور قرآن کے نزول پر کس قدر رشک و حسد کے جذبات موج زن ہیں، فرمایا ہے:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (بقرہ - ۱۲)

ترجمہ: جو کوئی بھی جبریل کا دشمن ہو (اسکو معلوم ہونا چاہیے) کہ قرآن کو تمہارے قلب (اے پیغمبر اسلام) جبریل نے اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے۔

آیات قرآنی کے علاوہ بے شمار صحیح روایات میں بھی فرشتوں اور جبریل کے متعلق بکثرت واقعات ملتے ہیں جن میں ان کی پیغام رسانی کی صفت کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے فرشتوں پر ایمان گویا کتاب الٰہی اور رسالت پر ایمان کا لازمہ ہے۔ جب ہم فرشتوں پر ایمان لاتے ہیں تو دراصل اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ ذریعہ جس سے اللہ کے پیغامات نبی تک پہنچے ہیں نہایت قابل اعتماد ذریعہ ہے اور جب نبی پر ایمان لاتے ہیں تو یہ دراصل اس بات پر ایمان ہے کہ جس ذریعے سے یہ پیغامات نوع انسانی کو پہنچے ہیں وہ بھی قابل اعتماد ہے۔

الحاصل فرشتے، دنیا، برزخ، میدان حشر، جنت و دوزخ، سب جگہ اللہ کے حکم و ارادہ اور مشیت کے مطابق فرمانبرداری میں مصروف و منہمک ہیں، اور ان کی شان عبدیت بالکل عیاں ہے، لہٰذا ملائکہ پر ایمان لانے کا مدعا یہ ہے کہ انسان اپنے اندر "عبدیت کبریٰ" کی حقیقت پیدا کرے، مجموعی کائنات اور بالخصوص ملائکہ کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے اپنی بہیمیت، حیوانی خصوصیات، اور بشری کمزوریوں پر غالب آنے کی سعی کرے، اور اپنی زندگی کے اختیاری حصے کو بھی اسی خلاق عالم کے آگے جھکا دے جس طرح غیر اختیاری حصہ میں وہ چار و ناچار جھکا ہوا ہی ہے۔ اپنی زندگی کے لمحہ لمحہ میں یہ ملحوظ رکھے کہ اللہ کی جانب سے اس کے اختیاری اعمال و کردار پر فرشتوں کی نگہبانی اور ان کی لکھائی جاری ہے اور یہ ریکارڈ ہو کر اللہ کے حضور قیامت میں پیش ہونے والی چیزیں ہیں۔ اس طرح ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالملائکہ کے ذریعہ بھی انسان اپنے مقصد تخلیق کو ہر وقت مستحضر رکھے تاکہ عالم انسانیت میں "خلافت الٰہیہ" کا نظام قائم ہو اور فساد و سفک دماء کی جگہ زمین میں عدل و صلاح کا دور دورہ ہو۔

(باقی)

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

(۳)

مترجمہ جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

عدم تقلید کا زمانہ اب یہ بات معلوم کرنی چاہیے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں کسی مخصوص مذہب فقہی کی تقلید پر لوگ متفق نہ تھے، چنانچہ ابو طالب مکی اپنی کتاب "قوت القلوب" میں فرماتے ہیں:۔

"لوگوں کی یہ (فقہی) تصنیفات اور تالیفات تو بعد کی چیزیں ہیں۔ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لوگوں کے اقوال (بطور حجت شرعی) پیش کرنے کا رواج نہ تھا اور نہ یہ قاعدہ تھا کہ کسی ایک ہی شخص کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے، ہر مسئلہ اور معاملہ میں اسی کی رایوں کو اختیار اور بیان کیا جائے اور اسی کے مذہب کو مدار یقین قرار دے لیا جائے۔"

بلکہ لوگوں کا حال اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس وقت لوگوں کے دو طبقے تھے، ایک طبقۂ علماء دوسرا طبقۂ عوام۔ عوام کا حال یہ تھا کہ وہ اُن اجتماعی اور اصولی مسائل میں، جو تمام مسلمانوں یا عام ارباب اجتہاد کے درمیان متفق علیہ تھے، براہ راست شارع علیہ السلام ہی کی تقلید کرتے تھے (نہ کہ کسی امام ومجتہد کی)۔ اور وضو وغسل کے طریقے اور نماز وزکوٰۃ وغیرہ کے احکام یا تو اپنے بزرگوں سے سیکھ لیتے، یا اپنی بستیوں کے اصحاب درس وتدریس سے، اور اسی کے مطابق خود عمل کرتے۔ اور جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو جس مفتی کو پاتے، بلالحاظ مسلک ومذہب، اسی سے فتویٰ پوچھ لیتے۔ ابن ہمام اپنے رسالہ "التحریر" کے آخر میں لکھتے ہیں:

"لوگ کبھی ایک عالم سے فتویٰ پوچھتے کبھی دوسرے عالم سے، ایک ہی مفتی سے فتویٰ پوچھنے کا التزام نہ تھا۔"

رہے علما تو ان کے دو گروہ تھے:

ایک گروہ ان علما کا تھا جنھوں نے کتاب و سنت اور آثار صحابہ کی تلاش (وتحقیق) میں پوری کاوش فکر صرف کرکے، بالقوۃ — ایسی بالقوۃ جس کو بالفعل ہی کہنا چاہیے — اتنی استعداد بہم پہنچائی تھی کہ عوام کے سامنے ایک (صاحب علم ونظر) مفتی کی حیثیت سے آسکیں، ایسے صاحب فکر ونظر مفتی کی حیثیت سے، جو مسائل کا جواب بالعموم دے سکے اور جس کو توقف سے دوچار ہونے کی نوبت کم ہی پیش آئے۔ یہ لوگ مجتہد مطلق کہے جاتے ہیں۔

یہ استعداد (اجتہاد) دو طرح حاصل ہوتی ہے، کبھی تو اس طرح کہ ہر امکانی کوشش صرف کرکے روایات کو جمع کیا جائے۔ کیونکہ احکام کا ایک بڑا حصہ احادیث میں، اور ایک بڑا حصہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے آثار واقوال میں موجود ہے (اس لیے ایک مجتہد بڑی کامیابی کے ساتھ اس ذخیرۂ روایات سے مسائل کا جواب معلوم کرسکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قوت اجتہاد بہم پہنچنے کے لیے صرف روایات کا اندوختہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک ادیب کی سی نظر اور ایک محدث کا سا فہم بھی ضروری ہے)۔ سو یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والا عالم زبان، مواقع کلام کی، اور ایک عالم روایات، اصول تطبیق روایات اور ترتیب دلائل وغیرہ امور کی معرفت سے کبھی بیگانہ نہیں ہوا کرتا۔ استعداد اجتہاد کی زندہ مثال امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔ کبھی یہ استعداد تخریج کے طریقوں کو پوری طرح ذہن میں جما لینے، اور ان اصولی قواعد وضوابط کو دماغ میں محفوظ کرلینے سے پیدا ہوتی ہے جو ہر باب کے متعلق ائمہ فقہ سے منقول ہیں، بشرطیکہ اس کے ساتھ ہی احادیث اور آثار کا ایک معقول ذخیرہ بھی انسان کے پاس موجود ہو۔ اس نوع استعداد کی کامل مثال تم کو امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن کی ذواتہائے گرامی میں ملے گی۔

دوسرا گروہ ان علما کا تھا جو قرآن وسنت پر اتنی نظر تو رکھتے تھے جس سے فقہ کے اصول ومبادی اور اس کے بنیادی مسائل کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ معلوم کرسکیں لیکن (جو جزئی مسائل ان کے سامنے آتے تھے) ان کے ایک حصہ پر اگرچہ خود دلائل کی روشنی میں رائے قائم کرلیتے تھے تو باقی دوسرے حصہ

میں توقف اختیار کرنے پر مجبور ہو کر علماء کے مشورے کے محتاج بھی ہوتے تھے، کیونکہ وہ اپنے اندر اجتہاد کامل کی پوری شرائط نہیں رکھتے تھے جس طرح کہ ایک مجتہد مطلق رکھتا ہے۔ پس اس قسم کے علما بعض مسائل کے لحاظ سے مجتہد اور بعض کے لحاظ سے غیر مجتہد تھے۔ صحابہؓ اور تابعینؒ کے متعلق یہ چیز تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جب ان کو کوئی حدیث پہنچتی تو وہ بغیر کسی شرط اور قید کے اس پر عمل کرنا شروع کر دیتے۔

شخصی تقلید کا آغاز

تیسری صدی ہجری تقلید شخصی کا پیام لے کر آئی اور لوگوں کے اندر کسی ایک ہی متعین مجتہد کے مذہب کی پابندی نے اپنے ظہور کا اعلان کیا۔ اب ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جو تقلید شخصی کے دائرہ سے باہر ہوں۔ اس وقت یہ چیز وجوب کا مرتبہ حاصل کر چکی تھی جس کا ایک خاص سبب تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ فقہ کے کسی طالب علم کو دو ہی صورتیں پیش آ سکتی ہیں:

(۱) یا تو اس کی تمام تر توجہ ان مسائل کی واقفیت بہم پہنچانے، ان پر نقد کرنے، ان کے مآخذ کی تحقیق کرنے اور ان میں باہم ترجیح دینے پر مرتکز ہو جن کا جواب ائمہ مجتہدین تفصیلی دلائل کے ساتھ پہلے دے چکے ہوں۔ یہ ایک ایسا بھاری اہمیت کا کام ہے جو اس وقت تک کامیابی کے ساتھ سر انجام نہیں پا سکتا جب تک کہ اس فقیہ کو کسی ایسے امام مجتہد کی رہنمائی میسر نہ ہو جس نے فقہ کے ایک ایک باب میں مسائل کو پھیلا کر بیان کرنے اور ان کے دلائل کو مہیا کرنے کی زحمتوں سے اس کو بے نیاز کر دیا ہو، تاکہ وہ امام کی ان تصریحات سے مدد لے کر نقد و تحقیق اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کی مہم میں (یکسو ہو کر) مشغول ہو سکے۔ ورنہ، اگر بالفرض کسی امام کی اقتدا اسے میسر نہ ہو تو ایک کامیاب فقیہ بننا اس کے لیے دشوار ہو جائے، اور ظاہر ہے کہ سہل راہ ہوتے ہوئے دشوار گذار راہ اختیار کرنا کھلی ہوئی لغویت ہے۔

یہ ایک امر واقعی ہے کہ علم فقہ کا یہ طالب (جس امام کی پیروی میں داد تحقیق دے رہا ہے) اس کے بعض اقوال کو پسندیدہ سمجھ کر ان سے اتفاق کرے گا تو بعض سے اختلاف بھی کرے گا۔ (اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اتفاق اور اختلاف کا تناسب کیا ہے) اگر اختلاف اتفاق سے کم ہے تو ایسی صورت میں یہ فقیہ اسی امام مجتہد کے مذہب کے اندر "اصحاب وجوہ"[۱۵۵] میں سے شمار کیا جائے گا، اور اگر صورت حالات

۱۵۵؎ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے

اس کے برعکس ہو تو اس وقت (وہ اصحاب وجوہ میں سے نہ شمار کیا جائے گا یعنی) اس کی انفرادی رائیں مذہب مذکور کا ایک جزو نہ قرار پائیں گی۔ لیکن اس کے باوجود وہ فقیہ فی الجملہ اسی امام مذہب ہی کی طرف منسوب رہے گا اور (اسی نسبت کے ذریعہ) ان لوگوں سے متمیز رہے گا جو کسی اور امام کی، اس کے مذہب کے اکثر اصول و فروع میں، اقتدا کر رہے ہوں[۱]۔

اس قسم کے صاحب علم کے بعض اجتہادی مسائل لازماً ایسے پائے ہی جائیں گے جن کے جواب سے اب تک کی فقہی تصنیفات بالکل خاموش ہوں گی، کیونکہ انسانی زندگی میں نت نئے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں اور اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے (اس لیے بعض مسائل میں اس صاحب علم کا اپنے ذاتی اجتہاد سے کام لینا ایک امر ناگزیر ہے) سو وہ ان مسائل کا جواب اپنے امام مجتہد کی دستگیری کا خیال ترک کر کے، براہ راست کتاب و سنت اور اقوال سلف سے معلوم و مستنبط کرتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے (اچھوتے) مسائل کی تعداد ان مسائل کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے جن کا (کوئی نہ کوئی) جواب پہلے کے علماء و ائمہ دے چکے ہیں ـــــ ایسے شخص کو "مجتہد مطلق منتسب" کہا جاتا ہے۔

(۲) یا پھر اس کی ساری توجہات کا مرکز ان مسائل پر دسترس حاصل کرنا ہو جن کو فتویٰ پوچھنے والے اس سے دریافت کریں اور جن کے متعلق علمائے سلف کا کوئی جواب منقول نہ ہو۔ ایسا عالم فقہ ایک ایسے امام کی اقتدا کا، مذکورہ بالا عالم فقہ سے بھی زیادہ، محتاج ہے جس کی فقہ کے ایک ایک باب کے مرتب شدہ اصولوں میں رہبری سے وہ فائدہ حاصل کر سکے، کیونکہ فقہ کے مسائل باہم گتھے ہوئے ہیں اور ان کی فروع

(حاشیہ صفحہ سابق) [۵] "اصحاب وجوہ" سے مراد وہ علما ہیں جو ہوں تو کسی امام مجتہد کے مقلد، اور اسی کے اصول و اقوال سامنے رکھ کر مسائل کی تخریج کرتے ہوں مگر بعض جزئی مسائل میں کچھ اپنے مخصوص دلائل کی بنا پر اپنے امام کی رائے سے اختلاف بھی کر جاتے ہوں، اس قسم کی یہ اختلافی رائیں بھی اسی امام کے مذہب کا ایک جز سمجھی جاتی ہیں۔ (مترجم)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک عالم کسی ایک امام مجتہد کی اقتدا میں یہ روش اختیار کر سکتا ہے کہ اس کے اکثر و بیشتر اصولوں کو ماننے کے باوجود بے شمار مسائل میں اس سے اختلاف کرے، اسی طرح دوسرے ائمہ کی اقتدا میں دوسرے علما بھی یہی روش اختیار کر سکتے ہیں، تو اگرچہ اس قسم کے علما کو ان ائمہ کا مقلد نہیں کہنا چاہیے مگر ان سب کے باوجود ہر عالم اپنے امام کی طرف اس وجہ سے منسوب کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ انتساب اسی قسم کے دوسرے علما کے مقابلہ میں باعث امتیاز بن سکے۔ (مترجم)

وجزئیات ان کے اصول سے گہری وابستگی رکھتی ہیں، تو اگر یہ عالم (بطور خود) تمام مذاہب فقہ کی جانچ پڑتال اور تمام مجتہدین کے اقوال کی چھان بین از سر نو شروع کرے تو اپنے کو ایک ایسی گھاٹی میں لا ڈالے جس کو طے کرنے کی اس کے قدموں میں سکت نہیں اور جس سے غالباً وہ ساری عمر چل کر بھی باہر نہ نکل سکے پس اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جن مسائل کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے ان پر غور و فکر کی نگاہ ڈالے (اور ان کو سامنے رکھتے ہوئے مزید جزئیات کی) تفریع میں ہمہ تن مشغول ہو جائے۔ (لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ ایسا فقیہ کبھی بھی اپنے امام مجتہد سے اختلاف نہیں کرتا، نہیں، بلکہ) بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کتاب و سنت اور اقوال سلف اور اپنے ذاتی قیاس کی بنا پر اپنے امام کے خلاف رائے قائم کرتا ہے، لیکن یہ اختلاف موافقت کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا ہے ــــ ایسا عالم "مجتہد فی المذہب" کہلاتا ہے۔

(یہی دو صورتیں ہیں کہ اُس وقت ایک طالب علم فقہ کو عملاً انہی دو میں سے ایک سے واسطہ پڑ سکتا تھا) رہ گئی تیسری صورت، یعنی یہ کہ وہ پہلے تو اپنی ساری کوشش ان مسائل کی دلیلیں معلوم کرنے میں صرف کر ڈالتا جن کا جواب پہلے کے علما دے چکے ہیں، پھر کہیں جا کر ان میں سے اپنے پسندیدہ اور مختار مسائل کو سامنے رکھ کر مزید مسائل کی تفریع میں منہمک ہوتا، تو یہ صورت عملاً ایک ناممکن اور غیر واقعی صورت ہے، کیونکہ نزول وحی کا بابرکت زمانہ گذرے ہوئے ایک مدت بیت چکی تھی، جس کے باعث ہر عالم کے لیے ان امور میں سے، جن پر علم اور عالمیت کا دار و مدار ہے، اکثر کے اندر علمائے سلف کا دست نگر ہونا ضروری ہو گیا، مثلاً کون حدیث کتنے طریقوں سے، اور کن مختلف عبارتوں میں مروی ہے؟ کون راوی کس پایہ کا ہے؟ کون حدیث کس مرتبہ میں صحیح یا ضعیف ہے؟ مختلف احادیث و آثار میں مطابقت کیونکر پیدا کی جائے؟ کون سی احادیث فقہ کا ماخذ ہیں؟ اسی طرح مشکل اور غریب الفاظ کے معنی کی تحقیق کرنا، فقہ کے اصولوں کا علم حاصل کرنا اور ان تمام بے شمار مسائل کو پوری شرح و بسط اور توضیح اختلاف باہمی کے ساتھ بیان کرنا جن میں علمائے سلف کلام کر چکے ہیں، پھر ان مختلف روایات (اور مسائل) کے اندر راجح اور مرجوح کا فیصلہ کرنے اور ان کو دلائل پر رکھ کر پرکھنے میں اپنے قوائے فکر و تحقیق کو لگا دینا وغیرہ

(بے شمار کام ایسے تھے جن میں متقدمین کے افکار و تحقیقات پر اعتماد اور ان سے استفادہ کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارہ کار ہی نہ تھا) اور اگر وہ بطور خود ان کاموں میں اپنی زندگی کے لمحات ختم کر ڈالتا تو پھر (مزید مسائل ضروریہ کی) تفریع کا حق کیونکر پورا ہو سکتا؟ جبکہ انسانی دماغ کے متعلق یہ ایک ناقابل انکار مسلمہ ہے کہ خواہ وہ کتنا ہی ذکی کیوں نہ ہو مگر اس کی ایک متعین حد ہے جس کے آگے وہ پرواز نہیں کر سکتا۔

ہاں یہ کمال فکر و نظر ان علما کو ضرور حاصل ہو سکا تھا جو باعتبار زمانہ بزم اجتہاد کی صف اول میں تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وحی کا زمانہ گذرے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی علوم کی یہ گوناگونی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ کمال چند نفوس سے زیادہ کو حاصل نہ ہو سکا، اور وہ چند نفوس بھی اپنے تمام اوصاف کمالیہ کے باوصف (دوسرے علما و مشائخ کی علمی رہنمائی اور اعانت سے یکسر بے نیاز نہ تھے بلکہ) اپنے مشائخ ہی کی پیروی اختیار کیے ہوئے تھے اور انہی کے سہارے راہ اجتہاد میں قدم اٹھاتے تھے، لیکن چونکہ اس علم میں انھوں نے کافی تصرفات کیے (اور اپنی ذاتی تحقیقات کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر گئے) اس لیے وہ مستقل امام اور مجتہد ہو گئے۔

وجوب تقلید پر عام امت کا اجماع مختصر یہ کہ ائمہ مجتہدین کے مذاہب کو اختیار کر لینا ایک قدرتی راز تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے (بعض حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر) علما کے دلوں میں ڈالا اور انھیں اس پر متفق کر دیا، خواہ (اس اتفاق کے لیے اقدام اور اس کے مصالح کا) علم و احساس انھیں ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ ہمارے اس خیال کی تائید (دیگر اقوال علما کے علاوہ) مشہور شافعی فقیہ ابن زیاد یمنی کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جن کو انھوں نے ایسے دو مسئلوں کے متعلق استفسار کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے جن کے اندر امام بلقینی نے امام شافعی کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ یہ الفاظ فتاویٰ ابن زیاد میں اس طرح تحریر ہیں:-

> "تم بلقینی کے کلام کی توجیہ نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ تمھیں یہ معلوم ہو کہ ان کا علمی مقام کیا تھا۔ سو (پہلے یہ جان لو کہ) وہ "امام مجتہد مطلق منتسب، غیر مستقل، صاحب تخریج و ترجیح" ہیں۔ "مجتہد مطلق منتسب" میں اس شخص کو کہتا ہوں جو اپنے اُس امام کے مذہب میں، جس کی طرف وہ منسوب ہے،

ترجیح کا اختیار رکھتا ہو اور قول راجح کی مخالفت بھی کر سکتا ہو۔ اکابر علمائے شافعیہ میں سے ـــ متقدمین میں سے بھی اور متاخرین میں سے بھی ـــ اکثر کا یہی حال ہے، جن کا تذکرہ اور جن کے درجات کی ترتیب کا بیان آگے آتا ہے۔ اچھا تو بلقینی کو جن ارباب نظر نے "مجتہدین مطلق منتسب" کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔ ان میں سے ایک ان کے شاگرد ولی ابوزرعہ بھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے استاذ امام بلقینی سے پوچھا "آخر یہ کیا بات ہے کہ شیخ تقی الدین سبکی اجتہاد سے کتراتے ہیں، حالانکہ ان کے اندر اجتہاد کی تمام شرائط موجود ہیں؟ وہ تقلید کیوں کرتے ہیں؟" ابوزرعہ نے اس کے بعد فرمایا کہ "میں نے شرم کی وجہ سے خود ان کا نام نہ لیا (حالانکہ یہی سوال خود ان کے متعلق بھی پیدا ہو رہا تھا) جس کی وجہ میرا یہ خیال (وہ یہ) تھا کہ (اس طرح دوسروں کے نام پر) میں اس امر کے حقیقی وجوہ دستیاب کر سکوں گا۔ لیکن امام بلقینی یہ سوال سن کر خاموش ہو رہے تو میں خود ہی بولا کہ "میرے نزدیک تو اس کی وجہ صرف وہ سرکاری ملازمتیں ہیں جو (حکومت کی طرف سے) چاروں مذاہب فقہی کے علماء کے لیے (مخصوص اور) مقرر ہیں اور یہ کہ اگر کوئی شخص ان مذاہب کی تقلید سے آزاد ہو کر بطور خود اجتہاد کرنے لگے تو پھر وہ اس حق سے محروم ہو جائے گا، قضا کے عہدے اسے نہ مل سکیں گے، لوگ اس سے استفتا کرنا چھوڑ دیں گے اور وہ بدعتی مشہور ہو جائے گا"۔ میری یہ بات سن کر امام بلقینی مسکرا اٹھے اور اس سے اتفاق کا اظہار کیا۔"

لیکن میرے (یعنی ابن زیاد یمنی کے) لیے ایسا گمان دشوار ہے کہ ان لوگوں نے اجتہاد سے اس (ذلیل) مصلحت کی بنا پر اجتناب کیا جس کی طرف ابوزرعہ نے اشارہ کیا ہے۔ ان بزرگوں کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ اجتہاد کی مکمل صلاحیتیں رکھنے کے باوجود عہدۂ قضا اور ذرائع معاش کی خاطر اجتہاد سے رکے رہتے۔ ان بزرگوں کے متعلق ایسا سوءِ ظن کسی طرح بھی مناسب نہیں کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا، جمہور کا مختار اور راجح مذہب یہ ہے کہ ایسا مرتبۂ علمی رکھنے والے کے لیے اجتہاد کرنا واجب ہے (اس لیے یہ کس طرح باور کیا جائے کہ ملازمت اور مشاہرے کے لالچ میں آ کر انہوں نے ایک امر واجب کو زندگی بھر ترک کیے رکھا؟ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ) ابوزرعہ کیسے

یہ کس طرح مناسب تھا کہ ان لوگوں کے بارے میں اتنی بھاری بات منہ سے نکالیں اور اس پر امام بلقینی کو اپنا موافق بھی ظاہر کریں؟ حالانکہ علامہ جلال الدین سیوطی کتاب "التنبیہ" کی شرح کے اندر، باب الطلاق میں، ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "ائمہ کے خود اپنے اقوال میں جو اختلافات واقع ہوئے ہیں[1] ان کی وجہ ان کے اجتہاد کا تغیر ہے، کسی موقع پر وہ جس چیز کو صحیح قرار دیتے ہیں وہ وہی چیز ہوتی ہے جو ان کے اجتہاد کی نظر میں اس وقت صحیح معلوم ہوتی ہے[2]۔ اور اس کتاب کا مصنف وہ شخص ہے جس کے رتبۂ اجتہاد کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ کتنے ہی علما نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ مصنف مذکور، ابن الصباغ، امام الحرمین اور امام غزالی اجتہاد مطلق کے مقام پر فائز تھے۔ اور یہ جو فتاویٰ ابن صلاح میں مرقوم ہے کہ یہ لوگ اجتہاد فی المذہب کا مرتبہ رکھتے تھے نہ کہ اجتہاد مطلق کا، تو اس کا مطلب در اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اجتہاد مطلق مستقل کا درجہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا مقام اجتہاد مطلق منتسب کا تھا، کیونکہ "اجتہاد مطلق" کی دو قسمیں ہیں، ایک تو مطلق مستقل، دوسرا مطلق منتسب، جیسا کہ خود ابن صلاح نے اپنی کتاب آداب الفتیا میں، اور امام نووی نے شرح "مہذب" میں اس کی تصریح کی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کا دروازہ تو چوتھی صدی ہجری کے اوائل ہی میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا جس کے کھلنے کا اب کوئی امکان نہیں۔ باقی رہی دوسری قسم تو وہ اب بھی باقی ہے اور آثار قیامت نمودار ہونے تک باقی رہے گی، (کسی زمانہ میں بھی) اس کا موقوف ہو جانا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے یعنی اگر کسی زمانہ کے مسلمان ایسا اجتہاد کرنے سے ہچکچانے لگیں یہاں تک کہ اسے یکلخت چھوڑ بیٹھیں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے، جیسا کہ ہمارے علماء فقہ، مثلاً

[1] یعنی ایک ہی امام نے ایک ہی مسئلے میں کبھی ایک فتوی دیا ہے اور کبھی اپنی پہلی رائے کے خلاف دوسرا فتوی دیا ہے۔ مثلاً امام شافعی کے اقوال میں یہ بات اکثر ملتی ہے کہ یہ ان کا پہلا قول ہے اور یہ دوسرا قول۔

[2] مطلب یہ ہے کہ ان ائمہ کے احساس ذمہ داری کا تو یہ حال تھا کہ جس وقت ان کا اجتہاد کسی مسئلے میں ایک بات کو حق پاتا تھا وہ بے تکلف اس کا اظہار کر دیتے تھے اور اس کی بھی پروا نہ کرتے تھے کہ ہم خود پہلے دوسری رائے ظاہر کر چکے ہیں۔

امام اوردی نے اپنی کتاب "الحاوی" میں، رویانی نے "البحر" میں، بغوی نے "التہذیب" میں اور اسی طرح کے اور بہت سے اکابر علماء نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے۔ یاد رہے کہ یہ فرض کفایہ، اجتہاد مقید (یعنی اجتہاد فی المذہب) سے ادا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ ابن صلاح اور امام نووی کی تصریحات بتلاتی ہیں۔ ہم نے بھی اپنی کتاب "الرد علی من اخلد الی الارض وجہل ان الاجتہاد فی کل عصر فرض" میں اس مسئلہ پر مفصل اور سیر حاصل بحث کی ہے۔

یہ ارباب علم (جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) محض اس وجہ سے کہ وہ اجتہاد مطلق منتسب کا درجہ رکھتے تھے، دائرہ شافعیت سے باہر نہ شمار کیے جائیں گے۔ جیسا کہ امام نووی نے، اور "طبقات" میں ابن صلاح نے واضح لفظوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے اور ابن سبکی نے بھی ان کی ہمنوائی کی ہے۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ ان حضرات نے مذہب شافعی کی کتابیں تصنیف کیں (اور ان کی فقہی تصنیفات فقہ شافعی کی کتابیں کہی اور مانی جاتی ہیں۔ پھر بحیثیت ایک شافعی فقیہ کے) فتوے دیے، اور شافعی مناصب پر مقرر کیے گئے، مثلاً اس کتاب کے مصنف اور ابن الصباغ کو بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں تدریس کی خدمت سپرد کی گئی، اور امام الحرمین اور امام غزالی کو نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں اور ابن عبدالسلام کو قاہرہ کے مدرسہ جابیہ اور مدرسہ ظاہریہ میں تعلیم کا انچارج بنایا گیا، اور ابن دقیق العید کو مدرسہ صلاحیہ میں، جو ہمارے امام (امام شافعی) کے مقبرہ سے لگا ہوا ہے، نیز مدرسہ فاضلیہ اور مدرسہ کاملیہ میں فرائض تعلیم حوالے کیے گئے۔ ہاں جو شخص اس مقام سے بھی اونچا ہو کر اجتہاد مطلق مستقل کے مقام بلند پر جا پہنچا ہو وہ البتہ حلقہ شافعیت میں شامل نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کے اقوال فقہ شافعی کی کتابوں میں درج کیے جا سکتے۔ لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اصحاب شافعی میں سے سوائے ابو جعفر ابن جریر طبری کے کوئی شخص بھی اس مقام تک نہیں پہنچا۔ ابن جریر البتہ پہلے شافعی تھے، پھر ایک مستقل مذہب فقہی کے امام مجتہد ہو گئے۔ اسی لیے علامہ رافعی وغیرہ نے فرمایا ہے کہ ابن جریر کا تفرد[1] مذہب شافعی کے وجوہ میں سے کوئی وجہ نہیں شمار ہوتا

---

[1] "تفرد" کا مطلب ہے کسی مسئلہ میں تمام علمائے فقہ شافعی کے خلاف رائے قائم کرنا۔ اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سیوطیؒ نے مذکورہ بالا الفاظ میں جو بات کہی ہے وہ میرے نزدیک ابو زہرہ کے خیال سے زیادہ اچھی ہے (اور اسی کو میں حقیقت کی ترجمانی سمجھتا ہوں) لیکن ان کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے کہ ابن جریر طبری کو شافعی نہ شمار کرنا چاہیے، وہ قابل قبول نہیں، کیونکہ یہی علامہ رافعی (جن کی رائے کا سیوطی نے حوالہ دیا ہے) کتاب الزکوٰۃ کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ "ابن جریر طبری کا تفرد مذہب شافعی کے وجوہ میں سے کوئی وجہ نہیں شمار ہوتا۔ اگرچہ وہ خود اصحاب شافعی کے طبقات میں شمار ہوتے ہیں"۔ اسی طرح امام نووی اپنی تصنیف "التہذیب" میں لکھتے ہیں کہ "ابو عاصم عبادی نے ابن جریر کا تذکرہ فقہائے شافعیہ کے سلسلہ میں کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ہمارے صف اول کے علماء میں سے ہیں۔ انھوں نے فقہ شافعی علامہ ربیع مرادی اور حسن زعفرانی سے حاصل کی تھی"۔ (پس وہ بہرحال ایک شافعی عالم تھے) اور ان کے شافعیت کی طرف منسوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا طریقۂ اجتہاد اور ان کا اسلوب استقراء و ترتیب دلائل قریب قریب بالکل وہی تھا جو امام شافعیؒ کا تھا، اور ان کے مجتہدات بالعموم امام موصوف کے مجتہدات سے ہم آہنگ تھے۔ اور اگر کبھی مخالف پڑے بھی تو ویسے ہی کہ وہ کوئی خاص اہمیت حاصل نہ کر سکے۔ مختصر یہ کہ ایسے مسائل بہت کم ہیں جن میں انھوں نے امام شافعی سے الگ کوئی راہ اختیار کی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ) یہ چیز ان کے دائرہ شافعیت میں داخل سمجھے جانے کے خلاف کوئی حجت نہیں بن سکتی۔

امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کا موقف فقہی بھی یہی نوعیت رکھتا ہے اور ان کا شمار بھی طبقات شافعیہ میں ہے۔ اُن لوگوں میں سے جنھوں نے امام بخاری کو طبقات شافعیہ میں شامل کیا ہے، ایک علامہ تاج الدین سبکی بھی ہیں جو فرماتے ہیں کہ "امام بخاری نے فقہ حُمَیدی سے سیکھی اور حُمَیدی نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) جس طرح امام غزالی، علامہ ابن عبد السلام اور امام الحرمین وغیرہ علمائے شافعی کے منفرد اقوال (جن میں وہ تنہا ہوتے ہیں اور دوسرے تمام علمائے شافعی بلکہ خود امام شافعی کی رائے بھی ان کے خلاف ہوتی ہے، اپنے تفرد کے باوجود مذہب شافعی ہی کے اقوال مانے جاتے ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "مذہب شافعی میں ایک قول یہ بھی ہے"۔ اس طرح ابن جریر طبری کے اختلافی اقوال کو (جن میں وہ تنہا ہوتے ہیں) مذہب شافعی کے اقوال نہیں مانا جاتا اور ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس مسئلہ میں مذہب شافعی کے اندر ایک قول یہ بھی ہے۔

امام شافعیؒ سے۔" ہمارے استاذ علام نے بھی امام بخاری کے حلقہ بگوش شافعیت ہونے پر یہی دلیل دی ہے کہ تاج الدین سبکی نے ان کا تذکرہ طبقات شافعیہ میں کیا ہے۔ نوویؒ کی جو عبارت ہم نے اوپر نقل کی ہے اس سے اس (طرز استدلال کی صحت) کی پوری تائید بھی ہوتی ہے۔ شیخ تاج الدین سبکی اپنی کتاب 'طبقات' میں فرماتے ہیں:

"کسی ایسے تخریجی مسئلہ کے سلسلہ میں، جس کی تخریج بالکل اچھوتی ہو، دیکھنا چاہیے کہ تخریج کرنے والا کن لوگوں میں سے ہے؟ اگر وہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر عموماً شافعیت اور تقلید غالب رہتی ہے، مثلاً شیخ ابو حامد غزالی اور قفال، تو اس کا شمار شوافع میں ہوگا، اور اگر اس کے برعکس وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اکثر حدود شافعیت سے باہر نکل جایا کرتے ہیں، مثلاً محمد بن جریر، محمد بن خزیمہ، محمد بن مروزی اور محمد بن منذر، تو وہ پیروان شافعیت میں نہ گنا جائے گا۔ رہا مزنی اور ان کے بعد ابن سریج کا معاملہ تو ان کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ ان کا مقام بین بین سا ہے، نہ تو وہ مذکورہ بالا چاروں حضرات کی طرح عموماً مذہب شافعی سے باہر ہی رہتے ہیں اور نہ عراقیوں اور خراسانیوں کی طرح حدود شافعیت کی پابندی کرتے ہیں۔"

نیز یہی علامہ سبکی اپنی 'طبقات' میں شیخ ابوالحسن اشعری امام اہل السنت والجماعت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "وہ شافعی کہے جاتے ہیں، کیونکہ فقہ انھوں نے شیخ ابو اسحاق مروزی سے حاصل کی تھی"۔ ہمارے اس نقطہ نظر کی تائید و شہادت "کتاب الانوار" کے صفحات میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس کا مصنف لکھتا ہے:

"جو لوگ شافعیہ یا حنفیت یا مالکیت یا حنبلیت کی طرف منسوب ہیں (اور ائمہ اربعہ کے پیرو سمجھے جاتے ہیں) ان کے چند طبقے ہیں:-

(۱) ایک تو طبقہ عوام ہے۔ جس کا (اپنے امام مثلاً) امام شافعی کی تقلید کرنا (براہ راست نہیں ہوتا بلکہ) ان مجتہدوں کے توسط سے ہوتا ہے جو امام مذکور کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرے وہ لوگ ہیں جو مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ایسا شخص جو خود مجتہد ہو کسی دوسرے مجتہد کی تقلید نہیں کرتا، مگر اس کے باوجود یہ لوگ ایک امام کی طرف اس بنا پر منسوب کر دیے جاتے ہیں کہ وہ طریق اجتہاد اور انداز استدلال اور اسلوب ترتیب دلائل وہی اختیار کرتے ہیں جو اس امام مجتہد مطلق کا ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا طبقہ متوسطین کا ہے یعنی وہ لوگ جن کو اگرچہ اجتہاد کا مقام حاصل نہیں ہو سکا مگر وہ اصول اجتہاد ان کے سامنے روشن ہوتے ہیں جن کو امام نے اختیار کیا تھا اور اس امر کی پوری قدرت رکھتے ہیں کہ جو مسئلہ (اقوال امام میں) تصریح کے ساتھ موجود نہیں، اس کو امام کے مصرح اقوال پر قیاس کر کے جواب دے سکیں۔ یہ لوگ بھی بہرحال امام کے مقلد (ہی) ہوتے ہیں، اور انھی کے ساتھ وہ عوام بھی جو ان کے اقوال کو اختیار کریں۔ (اب رہا یہ سوال کہ عوام ان کے قیاس کردہ اقوال پر عمل کرتے ہیں اس لیے ان کو بھی امام و مقتدیٰ کہا جائے یا نہ کہا جائے تو اس کے بارے میں) مشہور یہ ہے کہ ان کو یہ حیثیت حاصل نہیں، کیونکہ وہ تو خود ہی دوسرے کے مقلد ہیں"۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

(ان دلائل و شواہد کی روشنی میں اگر تم کسی متعین مذہب فقہی سے انتساب کے مفہوم اور حدود تقلید کی وسعت پر غور کرو گے تو تمھیں محسوس ہو جائے گا کہ دوسری صدی ہجری کے بعد تقلیدی رجحانات کے ہمہ گیر اور تقلید کے واجب ہو جانے کے متعلق ہمارا بیان واقعیت کی سچی ترجمانی ہے) اور اگر تم یہ اعتراض کرو کہ "جب شریعت ایک ہی ہے تو جو چیز ایک وقت میں واجب نہ تھی وہ کسی دوسرے وقت میں بھی واجب نہیں ہو سکتی، اس لیے تمھارا یہ کہنا کہ "مجتہد مستقل کی پیروی پہلے واجب نہ تھی، پھر واجب ہو گئی" ایک ایسی بات ہے (جو اپنی تغلیط آپ کر رہی ہے کیونکہ) اس کے اندر کھلا ہوا تناقض اور منافات موجود ہے"۔ تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اصل میں جو چیز واجب ہے وہ تو یہ ہے کہ امت کے اندر ایسا شخص یا اشخاص ضرور موجود رہنے چاہییں جو فروعی احکام پر ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ عبور رکھتے ہوں، اس وجوب پر تمام اہل حق کا اجماع ہے۔ (پھر یہ

اصول بھی بالکل مسلم اور بدیہی ہے کہ جس چیز پر کسی امر واجب کے حصول کا دار و مدار ہوتا ہے وہ خود بھی واجب ہوتی ہے۔ اور اگر کسی امر واجب کے حصول کے کئی ایک طریقے ہوں تو ان میں سے کسی ایک طریقہ کا حاصل کرنا واجب ہوگا (کسی متعین طریقہ کی خصوصیت نہ ہوگی)۔ لیکن اگر طریقہ ایک ہی ہو تو بالخاصہ اسی طریقہ کا حصول واجب ہوگا۔ مثلاً اگر ایک شخص بھوک کی شدت سے جاں بلب ہو اور اس بھوک کے دور کرنے کے متعدد ذرائع اس کے بس میں ہوں، جیسے کھانا خرید سکتا ہو، جنگل سے میوے چن سکتا ہو، اور کھانے کے قابل جانوروں کا شکار کر سکتا ہو، تو ان تینوں ذرائع میں سے بلاتعین کسی ایک کو اختیار کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر وہ شخص ایسے مقام پر ہو جہاں نہ تو کوئی شکار مل سکتا ہو نہ ہی میوے دستیاب ہو سکتے ہوں (اور بھوک دور کرنے کا ایک ہی چارۂ کار ہو) تو اس کے لیے واجب یہی ہے کہ پیسے خرچ کر کے کھانا خریدے (اسی مثال پر مسئلہ زیر بحث کو بھی قیاس کر لو)۔ اس واجب اصلی کے حاصل کرنے کے لیے، جس کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے، سلف کے پاس چند راستے تھے، سو ان کے لیے واجب یہ تھا کہ ان راستوں میں سے کسی ایک راستہ کو اختیار کر لیں، کسی خاص راستہ کی تعیین نہ تھی۔ پھر (کچھ قدرتی اسباب کے ماتحت) یہ تمام راستے ماسوا ایک کے بند ہو گئے۔ اندریں حالات سب کے لیے خاص اسی ایک راستہ کا اختیار کرنا ضروری ہو گیا۔ مثال کے طور پر دیکھو کہ سلف حدیثیں لکھا نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب، ہمارے زمانہ میں حدیثوں کی کتابت واجب ہو چکی ہے کیونکہ (زبانی نقل و بیان کا دستور اور سلسلہ مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے اور) آج روایتِ احادیث کا اس کے سوا کوئی ممکن طریقہ باقی ہی نہیں رہ گیا ہے کہ ان کی کتابوں کو سامنے رکھا جائے۔ یہی حال علوم نحو و لغت کا ہے، کہ یہ علوم بھی ایک لمحہ کے لیے سلف کی توجہ کو جذب نہ کر سکے، کیونکہ عربی ان کی اپنی زبان تھی، ان علوم (میں سر کھپانے) کی ان کو حاجت ہی کیا تھی۔ لیکن اب، اس زمانہ میں زبان عربی سے باقاعدہ واقفیت بہم پہنچانا واجب ہو چکا ہے، اس لیے کہ یہ زمانہ ابتدائی اہل عرب کے زمانے سے (جو عربی زبان کے ماہر اور نکتہ شناس تھے) کافی دور ہو چکا ہے۔ اسی طرح اس اصول کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

تقلید امام معین کب واجب ہے

پس اسی اصول پر تقلید امام معین کے وجوب کو بھی قیاس کرنا چاہیے، کہ اس کا بھی یہی حال ہے یعنی کبھی وہ واجب ہوتی ہے اور کبھی نہیں (مثال کے طور پر فرض کر لو کہ) اگر ہندوستان

یا ماوراء النہر کے کسی خطہ میں ایک جاہل مسلمان رہ رہا ہے اور اس کے قرب وجوار میں کوئی شافعی یا مالکی یا حنبلی عالم دین موجود نہیں، نہ ہی ان تینوں مذاہب کی کوئی کتاب موجود ہے، تو ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ مذہب ابو حنیفہ کی تقلید کرے اور حرام ہے کہ دائرۂ حنفیت سے قدم باہر نکالے، کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو (دائرۂ حنفیت کے ساتھ ہی) دائرۂ اسلام سے بھی باہر جا پڑے گا اور اس کے دین و ایمان کا کوئی وزن باقی نہ جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ایسا شخص حرمین میں ہو تو مخصوص طور پر کسی ایک ہی امام کی تقلید واجب نہ ہوگی کیونکہ وہاں اس کے لیے ہر مذہب فقہی سے رہنمائی حاصل کرنا ہمہ دم ممکن ہے۔ (پہلی صورت میں ایک ہی امام معین کی تقلید کے واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی دوسرے مذہب فقہی کا کوئی عالم موجود ہی نہیں تو وہ فتوے کس سے پوچھے گا؟ رہ گیا یہ امر کہ ظن و تخمین سے کام لے کر کسی دوسرے مذہب کی پیروی کرے، تو کسی مذہب کے احکام پر عمل کرنے اور اس کا حق تقلید ادا کرنے کے لیے) ظن و تخمین کفایت نہیں کر سکتا، اس کے لیے یقینی واقفیت ضروری ہے۔ اسی طرح اس کے لیے یہ بھی کافی نہیں کہ عوام کی سنی سنائی باتوں (کو کسی امام کے اقوال سمجھ کر ان) پر عمل کرے، یا یہ کہ کسی غیر معروف کتاب (پر اعتماد کرے اور اس) سے مسائل لے کر ان کی اقتدا کرنے لگے۔ چنانچہ النہر الفائق شرح کنز الدقائق میں یہ تمام تصریحات موجود ہیں۔

(باقی)

رسائل و مسائل

نظام باطل کے تحت مسلمانوں کا طریق کار

سوال (۱) میں اس وقت تک مسلم لیگ کے دامن سے بندھا ہوا ہوں، مگر میں اس کی جدوجہد کو لادینی ضرور تسلیم کرنے لگا ہوں اور اس حقیقت کو بھی سمجھ چکا ہوں کہ لیگ کی قیادت اسلامی نقطۂ نظر سے ایک "جاہلی بے عمل" قیادت ہے۔۔۔ مگر چونکہ رخصت و عزیمت کی دو راہیں خود اللہ نے مقرر فرمائی ہیں، اس وجہ سے لیگ کی جدوجہد اور قیادت کو گوارا کرتا ہوں۔ آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ رخصت سے فائدہ اٹھانے کا حق صرف فرد کو ہے یا قوم کو بھی؟

(۲) جب تک ہم اپنی اصلی راہ پر نہیں آتے، ضرورت ہے کہ موجودہ حالات کے اندر اپنے موجودہ اختیارات کو قائم رکھیں اور جو حقوق حاصل ہو چکے ہیں ان کو استعمال کریں مثلاً فرقہ وارانہ حقوق، کونسلوں میں نمائندگی، ملازمتوں میں حصہ وغیرہ

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ کر کے تو آ ہی جائے گی کوئی بجلی جلانے کے لیے!

آپ اس رائے سے کہاں تک متفق ہیں؟

(۳) میں پٹنہ یونیورسٹی کا ایک متعلم ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم غیر اسلامی ہے! کیا مجھے اس تعلیم کو منقطع کر دینا چاہیے؟ حالانکہ حضورؐ بازار عکاظ جیسے میلوں میں گئے ہیں اور فسق و طغیان کے مرکزوں میں پہنچے ہیں۔ ہماری نیت اگر بدی کو ختم کرنے اور نیکی کو فروغ دینے کی ہو تو پھر نہ غیر اسلامی تعلیم سے فائدہ اٹھانا غلط ہے، نہ نظام کفر کی ملازمتوں کا اختیار کرنا جرم رہ جاتا ہے، زیادہ سے زیادہ بس رشوت، جھوٹ، خیانت وغیرہ بد اخلاقیوں سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے اور ان

احتیاطوں کے ساتھ حسن نیت کا ہونا کافی ہے۔

جواب (۱) رخصت اور عزیمت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق فرد ہی کے لیے مخصوص ہے یا قوم کو بھی حاصل ہے، یہ ایک ضمنی سوال ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ رخصت و عزیمت کا تعلق دینی جدوجہد سے ہے یا ایک سرتاسر لادینی جدوجہد سے بھی؟ ہمارا خیال ہے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے صرف دینی جدوجہد کی راہ میں رخصت یا عزیمت کی دو راہیں رکھی ہیں۔ لیکن کسی لادینی جدوجہد میں چاہے آپ رخصت کی راہ اختیار کریں یا عزیمت کی، اسلام کو اس سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ اگر مسلم لیگ کی جدوجہد کو لادینی مانتے ہیں، جیسا کہ آپ کی تحریر سے ظاہر ہے تو پھر اس کے اندر آپ چاہے رخصت کے زاویہ میں پناہ لیں یا عزیمت کی وادیوں میں ٹھوکریں کھائیں، اس بارہ میں اسلام سے استفتا کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دوسری بات یہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ کسی دارالکفر میں اسلام کو غالب کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول نے افراد اور جماعت دونوں کے لیے ایک تدریجی پروگرام خود مقرر کر دیا ہے جس میں افراد کے ضعف و قوت کا بھی لحاظ ہے اور جماعت کی تدریجی صلاحیتوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ اس وجہ سے یہاں رخصت و عزیمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح ہر جماعتی پروگرام صرف اوسط درجہ کے افراد کی صلاحیتوں کے لحاظ سے بنایا جاتا ہے اسی طرح یہ پروگرام بھی عام حالات ہی کے لحاظ سے بنا ہوا ہے۔ اس پروگرام سے الگ ہو کر آدمی کے لیے عزیمت تو درکنار لادینی جدوجہد کے لیے رخصت کی کوئی راہ بھی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ گویا ایمان کا ادنیٰ ترین مطالبہ ہے جس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔

(۲) ہندوستان میں سیاسی ارتقا جس رخ پر ہو رہا ہے، اگر آپ نے اس کے ساتھ بہنا منظور کر لیا تو پھر آپ کے لیے اُس راہ پر پہنچنے کا کوئی امکان ہی نہیں رہ جاتا جس کو آپ اپنی "اصلی راہ" کہتے ہیں، بلکہ ہوگا یہ کہ آج اگر آپ اس سے ۱۰۰ میل دور ہیں تو کل اس سے ایک ہزار میل دور ہو جائیں گے۔ آپ کو "موجودہ حالات" سے محبت ہے تو آپ اس محبت کو باقی رکھیے لیکن آپ کی اس محبت اور خواہش آمیز تفکر سے حقائق تبدیل نہیں ہو جائیں گے۔ ہاں اگر آپ اپنی غلط فہمی کے ازالہ کے خواہشمند ہوں

تو جماعت اسلامی کا لٹریچر دیکھیے، خصوصاً سیاسی کشمکش کے تینوں حصے ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) اس طرح کے سوالات کو پڑھ کر دل کو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ کیا یہ لاکھوں مسلمان جو انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور جو انگریزی نظام کے اندر نوکریاں تلاش کرنے کے لیے در در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں، اُسی مقصد سے ان کالجوں اور محکموں میں جاتے ہیں جس مقصد سے آنحضرت صلعم عکاظ کے میلوں" اور "فواحش کے اڈوں" پر جاتے تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اس طرح کے غیر متعلق سوالات سے کیا فائدہ؟ اگر آپ لوگوں کا دل ایک غلط چیز کے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے تو نہ چھوڑیے لیکن یہ خواہش کیوں رکھتے ہیں کہ اللہ اور رسول بھی آپ کی خواہشوں کے پیچھے پیچھے چلیں۔ اس بات کو خوب یاد رکھیے کہ نظامِ باطل کا ہر شعبہ باطل ہے، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی بے ضرر اور معصوم کیوں نہ نظر آئے۔ کیونکہ کسی نظام پر جو حکم لگایا جاتا ہے وہ اس کے کسی خاص جز کے لحاظ سے نہیں لگایا جاتا، بلکہ اس کے کُل کے مجموعی مقصد کے لحاظ سے لگایا جاتا ہے۔ عیسائی مشنریوں کے بہت سے کام مثلاً ہسپتالوں وغیرہ کے قیام بظاہر نہایت اچھے ہیں، لیکن یہ تمام اجزا مل کر جس باطل مشن کو انجام دے رہے ہیں، اگر اس کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب شیطان کے پھندے ہیں۔

نیت کا سوال وہاں ہوتا ہے، جہاں کام فی نفسہٖ نیک ہو۔ اگر ایک نیک کام کو اچھی نیت سے کیا جائے تو اس پر ثواب ملے گا اور اگر بری نیت سے کیا جائے تو وہ ضائع ہو جائے گا۔ حرام اور ناجائز کاموں کو آپ کتنی ہی پاک نیت سے کریں وہ پاک نہیں ہو سکتے۔ ان میں تو صرف جرم کے اثبات کے لیے ارادہ کا ہونا دیکھا جائے گا، کہ اگر آپ نے حرام فعل کا ارادہ کیا تھا تو آپ مجرم ہیں اور اگر اس کا باقاعدہ ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ صادر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا۔ تعجب ہے کہ آپ حضرات کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ جو مسلمان ایک باطل نظام کا پرزہ بنا ہوا ہے اس کی نیت کا نیک ہونا اور ادائے فرائض میں اس کا دیانتدار اور راستباز ہونا اس کے کام کو جائز کیسے بنا دے گا۔ اگر وہ نہایت اخلاص کے ساتھ رشوت اور خیانت سے پاک رہ کر نظامِ کفر کی کل چلا رہا ہے تو وہ بس نظامِ کفر ہی کا مخلص و دیانتدار خادم ہے اور اس کے اخلاص و دیانت کا سارا فائدہ نظامِ کفر ہی کو پہنچتا ہے، نہ کہ اسلام اور حق کو۔

لہٰذا باطل کی مخلصانہ خدمت اس کے جرم کو دوچند کردے گی، نہ کہ اسے ثواب بنادے۔

تقیہ کے اصول پر نظامِ باطل میں شرکت

سوال: سورہ آلِ عمران کی آیت ۲۸ (رکوع ۳) کی توضیح مطلوب ہے۔ اس کا ترجمہ بروئے تفہیم القرآن یہ ہے:-

"مومن اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور ہم ساز ہرگز نہ بنائیں، جو ایسا کرے اللہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ، مگر اللہ تم کو اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمھیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔"

اس آیت کے ہر دو حاشیہ کے پڑھنے سے شبہہ ہوتا ہے کہ مسلم لیگی گروہ کا کفار سے تقیہ کرنا واجب ہے۔ ان کی طرف سے حجت بھی یہی پیش کی جاتی ہے کہ چونکہ کفار پوری طرح مسلمانوں پر مسلط ہو چکے ہیں اور ان کے نظامِ باطل نے ہمارے تن اور من دونوں کو اپنی گرفت میں مضبوطی سے لے رکھا ہے اس لیے اب مسلمانوں کے لیے محفوظ طرزِ عمل یہی ہو سکتا ہے کہ کفار کی دی ہوئی ڈھیل سے بتدریج فائدہ اٹھایا جائے اور اپنی جماعتی زندگی بچانے کے لیے فی الحال نظامِ باطل سے دوستی کا اظہار کیا جائے اور اس کے ساتھ اپنے عوام میں مذہبی شعور کو بیدار کیا جائے، یوں یہ صورتِ حالات بدل سکتی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا تقیہ آیا صرف شخصی طور پر درست ہے یا جماعتی حیثیت سے بھی؟

ذاتی طور پر تو میرا کامل ایمان اسی بات پر ہے کہ از روئے قرآن کوئی تنظیم اور جدوجہد جو سنتِ انبیاء سے ہٹی ہوئی ہو جائز نہیں ہے اور میرا گمان یہ بھی ہے کہ جو جماعت اصول قرآن سے بے نیاز ہو کر اور نظامِ باطل کا جزو بن کر کام کرنا چاہے اس کے لیے شرعی تقیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے تقیہ کا اگر سوال پیدا ہو سکتا ہے تو اس اسلامی جماعت کے لیے پیدا ہو سکتا ہے جو قرآنی اصولوں پر کام کرے۔ لیکن میں آپ سے اس مسئلہ کی تصریح چاہتا ہوں!

جواب: آپ نے تو اپنے سوال کا خود ہی صحیح جواب دے دیا ہے۔ تقیہ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، بہرحال شرعی حیثیت سے اس کا فائدہ اٹھانے کا حق صرف اس فرد یا جماعت کو حاصل ہو سکتا ہے جو

اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی اصول پر کام کرنے اٹھے اور کفار سے اس کا مقابلہ یا تصادم اس حیثیت سے پیش آئے کہ یہ اسلام کا کام ہو رہا ہے اور دشمنان اسلام اس کام کو دبا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں فرد تو انفرادی طور پر خود فیصلہ کرے گا کہ آیا اس میں مقابلہ پر ڈٹے رہنے اور مصائب برداشت کرنے کی طاقت ہے یا نہیں؟ اور اس بنا پر اس کو تقیہ کر کے وقتی طور پر اپنے آپ کو ان مظالم سے بچانے کی رخصت حاصل ہے؟ اور اگر جماعت اس حالت میں مبتلا ہو تو پھر یہ رائے جماعتی طور پر قائم کی جائے گی۔ لیکن جو جماعتیں نہ اسلام کے اصول پر قائم ہوئی ہوں، نہ دین کو دنیا میں غالب کرنا ان کا مقصود ہو، نہ کفار سے اسلام کی خاطر ان کو کوئی تصادم پیش آیا ہو، بلکہ اس کے برعکس نظام باطل ہی پر انھوں نے اپنی زندگی کو قائم کیا ہو اور کفار سے ان کی سیاسی کشمکش اسی نظام باطل ہی کے اندر بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے ہو رہی ہو تو ان کو آخر قرآن کی دی ہوئی رخصتوں سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے۔ اس بنا پر تو پھر کل یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جاپان جو آج امریکہ کے مقابلہ میں تقیہ کر رہا ہے، وہ بھی در اصل قرآن کی دی ہوئی رخصت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

دہریت و مادہ پرستی اور قرآن

سوال: آپ نے اپنے مضمون "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں اصطلاحاتِ اربعہ کے جو معانی بیان کیے ہیں ان سے، جیسا کہ آپ نے خود ذکر فرمایا ہے، یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جس کی طرف نبی بھیجا گیا ہو اور اس نے اسے خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے یا خدا کو الٰہ و رب یعنی خالق و رازق ماننے کی دعوت دی ہو، کیونکہ ہر قوم اللہ کے فاطر و خالق ہونے کا اعتقاد رکھتی تھی۔ اس سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں منکرین خدا یعنی مادہ پرست ملحدین اور دہریوں کا گروہ ناپید تھا، حالانکہ بعض آیات سے ان لوگوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً: وما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیی وما یھلکنا الا الدھر (جاثیہ) "بس ہماری زندگی تو یہی دنیا کی زندگی ہے کہ مرتے ہیں اور جیتے ہیں ــــ اور یہ زمانہ (یعنی نظم فطرت) ہی ہمیں ہلاک کرنے والا ہے۔"

نیز موسیٰ و فرعون اور نمرود و ابراہیمؑ کے مذاکروں میں بعض آیات اس امر پر صریح الدلالت ہیں کہ یہ دونوں مادہ پرست دہریہ تھے۔ مثلاً افی اللہ شک فاطر السموٰت والارض؟ (ابراہیم) ترجمہ:۔"کیا خدا کے وجود میں بھی کوئی شک و شبہ ہے جو موجدِ ارض و سما ہے؟" پھر دوسری آیت ہے۔ ام خلقوا من غیر شیءٍ، ام ھم الخالقون؟ (النجم) "کیا وہ بدون کسی خالق کے آپ سے آپ پیدا ہوگئے یا وہ خود خالق ہیں؟"

آپ نے دوسری آیات سے استدلال کرتے ہوئے ان آیتوں کی جو توجیہ کی ہے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ کیونکہ اُن آیاتِ متمسک بہا کی دوسری توجیہیں ہو سکتی ہیں۔

جواب: میں نے جہاں تک قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہے اور جس حد تک تاریخی معلومات میرے سامنے ہیں، ان دونوں سے یہ بات مجھے قریب بہ یقین معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں کبھی کوئی قوم یا کوئی ہیئت اجتماعی (Community) ایسی نہیں گذری ہے جو بحیثیت مجموعی خدا کی منکر اور دہریہ رہی ہو۔ افراد اور چھوٹے چھوٹے فلسفیانہ گروہ ایسے ضرور رہے ہیں، لیکن وہ اتنے قابل لحاظ نہ تھے کہ براہ راست ان کو خطاب کرنے کے لیے کوئی نبی بھیجا جاتا یا کتاب نازل کی جاتی۔ اسی لیے قرآن مجید میں ایسے گروہوں کے متعلق کہیں کہیں مختصر اشارات تو ضرور کیے گئے ہیں لیکن دعوت کا براہ راست خطاب مشرکین ہی کی طرف ہے اور عموماً توحید پر جو دلائل دیے گئے ہیں وہ اس انداز سے دیے گئے ہیں کہ شرک کے ابطال کے ساتھ دہریت کا ابطال بھی انہی سے ہو جاتا ہے اور اس کے خلاف الگ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

فرعون اور نمرود کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض قیاس سے لکھا ہے۔ معتبر معلومات اس کے خلاف ہیں۔ آج ارض بابل اور ارض مصر دونوں کے متعلق آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے نہایت مفصل معلومات حاصل ہو چکی ہیں اور ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فراعنہ اور فرمانروایان بابل دونوں ہی پروہت راجہ (Priest Kings) تھے اور اُن آلہہ کو یہ دونوں نہ صرف یہ کہ مانتے تھے جن کی پرستش ان کی قوم کے ہاں ہوتی تھی بلکہ یہی فرمانروا ان کے مہا پجاری (Chief Priest) ہوتے تھے

انھیں ان آلہہ کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے مانا جاتا تھا۔ اسی کی تصدیق قرآن کے بیان سے بھی ہوتی ہے اور یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ اُس معنی میں دہریے نہیں تھے جس معنی میں آج کل یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

بہانہ جوئی کے لیے روایات کے سہارے

سوال: میں نے اپنے بعض اعزہ اور بزرگوں کی خدمت میں فریضۂ اقامت دین کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔ اس سلسلے میں میرا تبادلۂ خیال ایک ایسے رشتہ دار سے ہوا جو اصطلاحی علم بھی رکھتے ہیں۔ اقامت دین کے فرض کی اہمیت کے بھی منکر نہیں، مگر ادائے فرض کے لیے آمادہ ہو جانے کے بجائے حیلے کے سے عذرات پیش کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ حدیث ہے کہ:

اذا رایت شحاً مطاعاً وھویً متبعاً واعجاب کل ذی رأی برایہ

فعلیک بخویصۃ نفسک

اس سے استدلال کر کے وہ اپنے آپ کو ادائے فرض سے بری کرتے ہیں اور اس کو اتنی وقیع اور وزنی دلیل سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں ان کے نزدیک پورے قرآن اور سارے ذخیرۂ حدیث کی حجت بھی غیر اہم ہے۔ مثلاً میں نے حدیث شریف "من رأیٰ منکم منکراً فلیغیرہ" الخ اور "لتاخذن ید المسئ" الحدیث اور "من احیا سنتی" الحدیث، اور اسی طرح آیت "کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" الخ اور "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ" الخ اور بالخصوص "وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ" الخ سب ہی کو ان کے اطمینان کے لیے پیش کر دیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُس حدیث کا محمل یہ نہیں ہے کہ آپ فریضۂ اقامت دین سے سبکدوش ہو گئے! آمرین بالمعروف اور ناہین عن المنکر کی تمام تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ "شح مطاع" اور "ہوائے متبع" ان سب کے زمانوں میں برسرعمل تھی مگر انھوں نے مایوسی کو گناہ سمجھا اور سعی کی، تو کیا العیاذ باللہ وہ غلطی کے مرتکب تھے؟ اب میں آپ سے اس حدیث کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جواب: یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ کسی پوری قوم میں یا ساری کی ساری دنیا میں "شح مطاع"

اور "ہوائے متبع" کے سوا اب کچھ نہیں رہا، تجربے کی ضرورت ہے نہ کہ اپنی جگہ سمجھ بیٹھنے کی۔ اگر کوئی شخص حق کی طرف لوگوں کو دعوت دے اور تبلیغ کا جو حق ہے وہ ادا کر دے، اور پھر تجربے سے ثابت ہو کہ کوئی بھی اپنی ہوائے نفس کی پیروی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے اور سب کے سب باطل پرستی پر مصر ہیں، تب اس حدیث کے منشا کے مطابق آدمی کے لیے یہ درست ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑے اور صرف اپنی نجات سے غرض رکھے۔ لیکن عملاً کوشش کیے بغیر پہلے ہی سے یہ سمجھ لینا کہ دعوت اور تبلیغ اور تذکیر سے کچھ حاصل نہیں ہے، محض ادائے فرض سے جی چرانے کا ایک بہانہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی ذمہ داری ڈالنا بڑی جسارت اور سخت زیادتی ہے۔ آج اگر ہم اس حدیث کو حجت بنا کر اپنا وہ فرض ادا کرنے کی کوشش نہ کریں جو مومن ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتا ہے تو دنیا میں ہم اپنے نفس کو مطمئن کر سکتے ہیں، لیکن قیامت کے روز اگر ہم نے اللہ تعالیٰ کی بازپرس کے جواب میں یہ حدیث معذرت کے طور پر پیش کی اور نبی صلعم نے اُسی وقت ہمارے منہ پر اس کی تردید کر دی کہ میرا یہ مدعا نہ تھا اور ان لوگوں نے میری حدیث سے غلط معنی نکال کر محض حیلہ بازی کی تھی، تو بتائیے کہ ہمارے پاس جوابدہی کے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟

دراصل اس حدیث کا یہ منشا ہے ہی نہیں کہ بحیثیت مجموعی کسی پوری آبادی کے متعلق یہ قیاس کر لیا جائے کہ اس میں شح مطاع اور ہوائے متبع کے سوا کچھ نہیں ہے لہٰذا نصیحت اور تذکیر سے کچھ حاصل نہیں، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ ایسا ہو جس کے سامنے دعوت حق کو ٹھیک ٹھیک طریقے سے پیش کیا جائے اور پھر اس کے رویے سے یہ معلوم ہو کہ وہ اپنی شح اور اپنی ہوائے نفس کا بندہ بنا ہوا ہے تب اس کے اوپر تذکیر میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ آئی ہے کہ "اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ" اور "فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى"۔

سوال: ایک صاحب جو علم دین سے بخوبی واقف ہیں، خطبۂ جمعہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر کہ "میرے بعد ۳۰ سال خلافت رہے گی، بعد میں شاہی دور شروع ہو گا اور آخر میں امام مہدی صاحب جن کا حسب نسب یہ ہو گا تشریف لائیں گے اور خلافت قائم کریں گے،" یوں

حاشیہ آرائی کی کہ جو لوگ ظہور امام مہدی سے پہلے خلافت کے لیے جدوجہد کرتے ہیں وہ محض ڈھونگ رچاتے، اور وہ کانداری چلاتے ہیں۔ اس حاشیہ آرائی کے متعلق رائے گرامی کیا ہے؟

جواب: اس طرح کے استدلال جو لوگ حدیث سے کرتے ہیں وہ معلوم ہوتا ہے کہ علم سے بھی بے بہرہ ہیں اور خدا کا خوف بھی ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشنگوئیوں سے اگر اسی طرح کا استدلال کیا جانے لگے تو انسان گمراہی کی آخری سرحد تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں حضور نے یہ پیشنگوئی فرمائی ہے کہ مسلمان آخرکار یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چل پڑیں گے اور جہاں جہاں انھوں نے قدم رکھا ہے یہ بھی قدم رکھیں گے، حتیٰ کہ اگر ان میں کسی نے اپنی ماں سے زنا کیا ہو تو مسلمانوں میں بھی کوئی شخص اٹھے گا جو اس فعل کا ارتکاب کریگا۔ اب اگر اس پیشنگوئی سے استدلال کر کے کوئی شخص یہود و نصاریٰ کی پیروی شروع کر دے اور کہے کہ حضور خود یہ فرما گئے ہیں لہٰذا آپ کا یہ قول تو بہر حال ہم پر صادق آنا ہی ہے، تو ایسے شخص کے جاہل اور خوفِ خدا سے عاری اور گمراہ ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟

سوال: آپ فرقہ پرستی کے مخالف ہیں مگر اس کی ابتدا تو ایک حدیث سے ہوتی ہے کہ "عنقریب میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے صرف ایک ناجی ہوگا، جو میری اور میرے اصحاب کی پیروی کرے گا" (بلکہ شیعہ حضرات تو "اصحاب" کی جگہ "اہلبیت" کو لیتے ہیں)۔ اب غور فرمایئے کہ جتنے فرقے موجود ہیں، سب اپنے آپ کو ناجی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ۔ پھر ان کو ایک پلیٹ فارم پر کیسے جمع کیا جا سکتا ہے؟ جب ایسا ممکن نہیں تو ظاہر ہے کہ حاشیہ حاکمیت غیر اللہ کے بقا کی گارنٹی ہے۔ بہت سے لوگ اسی وجہ سے فرقہ بندی کو مٹانے کے خلاف ہیں کہ اس سے حدیث نبوی کا ابطال ہوتا ہے۔

جواب: جس قسم کا سوال آپنے کیا ہے اس پر اگر آپ خود اپنی جگہ غور کر لیتے تو آپ کو آسانی سے اس کا جواب مل سکتا تھا۔ احادیث میں مسلمانوں کے اندر بہت سے فتنے پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے جس سے مقصود اہل ایمان کو فتنوں پر متنبہ کرنا اور ان سے بچنے کے لیے تاکید کرنا تھا، لیکن وہ شخص

اس قدر گمراہ ہوگا جو صرف اس لیے فتنہ برپا کرنا یا فتنوں میں مبتلا رہنا ضروری سمجھے کہ احادیث میں جو خبر دی گئی ہے اس کا مصداق بننا ضروری ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی جیسے قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ بہت سے انسان جہنمی ہیں۔ تو کیا اب کچھ لوگ جان بوجھ کر اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنائیں تاکہ یہ خبر ان کے حق میں سچی نکلے؟

قیمتوں کا کنٹرول اور بازار کا حال

سوال: آڑھت کے سلسلہ میں ہم کو گندم خریدنی پڑتی ہے۔ گندم کی خرید و فروخت کے لیے اس وقت یہاں کنٹرول ریٹ مقرر ہے لیکن اس مقررہ نرخ پر گندم ملنی ممکن ہی نہیں ہے۔ چنانچہ منڈی کے تمام بیوپاری قدرے گراں نرخ سے خرید و فروخت کرتے ہیں لیکن رجسٹروں میں اندراج کنٹرول ریٹ سے ہوتا ہے۔ دکاندار خرید و فروخت میں کنٹرول ریٹ سے زائد جو قیمت لیتا دیتا ہے، اس کا حساب دکاندار کے کھاتوں سے نہیں بلکہ اس کی جیب سے متعلق ہوتا ہے۔ اب آپ فرمائیے کہ کیا اپنے استعمال کے لیے اور تجارت کے لیے اس ڈھنگ سے گندم خریدنا جائز ہے؟ نیز یہ امر بھی واضح ہونا چاہیے کہ اگر اس قسم کا کوئی معاملہ عدالت کی گرفت میں آجائے جس کا ہر وقت امکان ہے، تو کیا یہ جائز ہوگا کہ عدالت میں بھی کھاتے کے جھوٹے اندراجات کے مطابق بیان دیا جائے؟ واضح رہے کہ سچ بولنے سے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت عدالت مقررہ سزا نافذ کر دے گی۔

جواب: ان حالات میں آپ اپنے استعمال کے لیے تو بہر حال گندم خرید ہی سکتے ہیں کیونکہ اس صورت میں حساب رکھنے کا کوئی سوال نہیں ہے، البتہ دوکان کے معاملہ میں یہ ایک قباحت کا پہلو ہے کہ جس بھاؤ سے مال خریدا جاتا ہے اس کا کھاتے میں صحیح اندراج پرخطر بنا دیا گیا ہے۔ اگر اس کاروبار سے بچنے کی کوئی صورت ہو تو بہتر ہے اور اگر آپ کے لیے یہی ایک ذریعہ معاش ہو اور اس کے سوا کسی دوسرے کاروبار سے آپ اپنا رزق حاصل نہ کر سکتے ہوں، تو پھر آپ کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے لین دین کے حسابات مطابق واقعہ رکھیں۔ عدالت میں ۔ بیان دیا جاتا ہے

اس کی حیثیت شہادت کی ہے۔ پس غلط شہادت نہ دیجیے۔ صاف صاف کہہ دیجیے کہ آپ کی حکومت نے اپنی غلط پالیسی سے تمام ملک کو جھوٹا بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ کنٹرول اگر کیا تھا تو کنٹرول ریٹ پر اشیا فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی حکومت ہی کو لینی چاہیے تھی لیکن اس کا انتظام تو کیا نہیں اور کنٹرول ریٹ مقرر کر دیا۔ اب اگر کنٹرول ریٹ ہی سے ہم مال خریدنے پر اصرار کریں تو بازار سے ضروریات زندگی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ کنٹرول کا نام لیا جائے تو بائع سرے سے مال ہونے ہی کا انکار کر دیتا ہے اور بلیک مارکیٹ سے اپنی ضروریات فراہم کی جائیں تو آپ گلا دبانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بہرحال ہم نے جتنے میں خریدا ہے ہم تو وہی ظاہر کریں گے۔ آپ کے قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے جھوٹ بولنے کی وہ پالیسی ہم نہیں اختیار کر سکتے جو عام طور پر ہزاروں لاکھوں انسانوں نے مجبوراً اختیار کر رکھی ہے۔ آپ کا انصاف اگر ایسی حالت میں ہمیں سزا دینے کا متقاضی ہے تو دے دیجیے۔ ہمارے نزدیک تو از روئے انصاف کنٹرول آرڈیننس جاری کرنے والے سے لے کر اس تمام عملہ تک جو ان احکام کو نافذ کر رہا ہے اور جس کی زبردستی سے سارا ملک جھوٹ اور بے ایمانی کے طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اصل مجرم ہیں اور سزا اُن کو ملنی چاہیے۔

عملی اسلام سے اجتناب کا مشورہ

سوال: تحریک اسلامی سے مجھے بہت دلچسپی ہے مگر چند روز سے ایک اہم اعتراض دماغ میں چکر لگا رہا ہے، جسے آپ کے سامنے رکھ کر رہنمائی چاہتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر مسلمان موجودہ طاغوتی نظام سے بالکل علیحدگی اختیار کر لیں تو ان کی حیثیت ہندوستان میں غلام یا اچھوت کی سی رہ جائے گی۔ پس کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ آپ جیسے اعلیٰ دماغ حضرات مسلمانوں کو اس نظام سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش دے کر ذہنی تربیت کا کام کرتے رہیں، تاآنکہ پوری مسلمان قوم کی ذہنیت ایک ہی طرز فکر کی حامل ہو جائے اور پھر موقع آنے پر وہ یکدم نظام حق کے قیام کے لیے اٹھ کھڑی ہو۔

اگر تمام مسلمان آپ کی تحریک اسلامی کے ساتھ ہو گئے ہوتے تب تو طاغوتی نظام میں جذب ہوئے بغیر کامیابی کا امکان تھا مگر اب جبکہ مسلمانوں کی اکثریت تحریک اسلامی کے نام سے بھی واقف

نہیں اور علماء جن کا فرض ہی احیائے دین کی جدوجہد ہے اس کو نا قابل عمل بتاتے ہیں۔ نظام باطل سے کٹ کر کامیابی حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ پھر کیا آپ اس پر متفق نہیں ہوں گے کہ ابھی آپ صرف تبلیغی کام کرتے رہیں اور جب بالعموم مسلمانوں کے ذہن تحریک اسلامی کو سمجھنے لگیں اس وقت عملی کام کا آغاز کیا جائے؟

جواب: آپ کا مطلب جہاں تک آپ کے خط سے سمجھ میں آیا ہے، یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف زبانی تبلیغ تقریر و تحریر اور مضامین و رسائل کے ذریعہ سے جاری رکھی جائے اور جن اصولوں کی تبلیغ کی جائے ان پر نہ خود عمل کیا جائے، نہ دوسروں کو ان پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے۔ جب سارے مسلمانوں کے ذہن ہمارے خیالات سے متاثر ہو جائیں تب دفعۃً اٹھ کر انقلاب برپا کر دیا جائے۔ یہ خیال بہت بے ضرر اور بے خطر ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ تبلیغ اور انقلاب کی فطرت اس کے بالکل خلاف واقع ہوئی ہے موثر اور نتیجہ خیز تبلیغ ہوتی ہی اس وقت ہے جبکہ تبلیغ کرنے والی پارٹی اپنے اصولوں پر عمل کرتی ہے اور ان پر عمل کرنے والوں کی تنظیم کرتی ہے۔ خالی خولی وعظ تو بہت دنوں سے ہندوستان میں ہو رہے ہیں ان کا کیا نتیجہ ہوا؟ براہ کرم ترجمان القرآن کے تازہ پرچوں کے اشارات اور رسائل و مسائل غور سے ملاحظہ فرمائیے یہ عجیب معاملہ ہے کہ کچھ لوگ تو ہم کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تم بس لکھتے اور چھاپتے ہو، کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے۔ اور کچھ آپ جیسے لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ صرف لکھو اور چھاپو، مسلمانوں کو عمل کرنے کے خطرہ میں کیوں ڈالتے ہو ہماری درخواست یہ ہے کہ ان طعنوں اور مشوروں سے پہلے لوگ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم اپنی دعوت اور طریق دعوت دونوں میں حضرات انبیائے کرام کے پیرو ہیں، اس وجہ سے جس کو ہمیں کوئی مشورہ دینا ہو یا ہم پر اعتراض کرنا ہو، وہ اپنے مشورہ اور اعتراض پر حضرات انبیا کے قول اور عمل کی دلیل پیش کرے صرف مصلحت بازی اور خیال آرائی یا اندیشہ سازی ہماری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی، پس بہتر ہے کہ لوگ ہمیں اس سے معاف رکھیں۔

مطبوعات

اسلامی نظام

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی۔ قیمت عہ (ایک روپیہ)

ناشر:۔ دار الاشاعت نشأۃ ثانیہ، حیدر آباد (دکن)

اس کتاب میں زندگی کے نظریۂ اسلامی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس نظریہ کے ان اثرات کی طرف اشارات کیے گئے ہیں جو بحیثیت مجموعی زندگی پر نمودار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کتاب کے مرکزی پیغام سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں۔ مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اصطلاحات اور تعبیرات جن کے لباس میں نظریۂ اسلامی کو پیش کیا گیا ہے ان میں سے بعض غلط فہمی کی موجب ہوسکتی ہیں۔ نیز کتاب پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات "دل" سے نہیں "دماغ" سے نکل رہی ہے۔ ان اشارات کی توضیح کی نہ پرچے کے ان صفحات میں گنجائش ہے اور نہ کچھ زیادہ ضرورت ہے۔ مؤلف کی کوشش بہرحال قابل قدر ہے اور اس وقت جب کہ ہر چہار طرف باطل افکار و دوائر چھائے ہوئے ہیں، اس قسم کی ہر کوشش کا ہمیں خیر مقدم کرنا چاہیے۔

پیغام رسول

از جناب سید ابو الفاروق صاحب واسطی الہندی۔ قیمت عہ (ایک روپیہ)

ملنے کا پتہ:۔ رضا کمال بکڈپو، فاروق گنج، لاہور۔

دنیا میں بہت سے لوگ بہت سی کتابیں ایسی لکھتے ہیں جو کسی نہ کسی نقطۂ نظر اور کسی نہ کسی پہلو سے مفید تو ہوتی ہیں مگر "نیر بہدف" نہیں ہوتیں۔ چنانچہ یہ "پیغام" بھی ایک حد تک مفید پیغام تو ہے مگر "تیر بہدف" نہیں ہے۔ کچھ مناظرانہ سی باتیں بھی ہیں، کچھ لطیفہ گوئی بھی ہے، کچھ شدت سے برسنا بھی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ "پیغام رسول" کو ان صفات سے خالی ہونا چاہیے۔ پھر بعض مواقع پر تو محترم مؤلف موجودہ مسلمانوں کے ایمان کی حیثیت متعین کرنے میں حد اعتدال یا حد احتیاط کو صاف پھاند گئے ہیں۔ اور کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے۔ مناسب ہوتا کہ پیغام رسول کو پیش کرنے سے پہلے قرآن و حدیث سے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا جاتا۔ (ن۔ ص)

قصص النبیین للاطفال

مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی۔ استاذ تفسیر و ادب، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

۴۴ صفحے۔ کتابی سائز۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی اعلیٰ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جمعیۃ التعاون، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

اس کا رونا تو اب فضول ہے کہ ہمارا ملک عربوں کے ابرِ کرم سے گویا محروم رہا اور اس بدقسمت سرزمین کے حصے میں درۂ خیبر سے آنے والے ایسے فاتح آئے جن کی زبان ترکی یا فارسی تھی اور جن کا اسلامی تصور خود واضح اور صاف نہیں تھا۔ ظاہر ہے، ایسے بادشاہوں اور کشور کشاؤں کی سرپرستی میں عربی زبان کس طرح پروان چڑھ سکتی تھی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ آغازِ اسلام سے شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) سے پہلے تک شمالی ہند میں عربی کے دو چار اچھے لکھنے والے بھی نہیں ملتے۔ شمالی ہند کے مایۂ ناز شاعر آزاد بلگرامی تک کا یہ عالم ہے کہ ان کی شاعری خالص عجمی اور ہندی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ گجرات و سندھ کے علاقوں سے صرفِ نظر کر لیجیے، تو کیا دین، کیا زبان، ہر لحاظ سے شمالی ہند میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا ——

یہ ایک ٹھوس تاریخی حقیقت ہے۔ خواہ اربابِ "غنیمت" اور ملوکیت پرستوں کو اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ لیکن ہماری اور آپ کی آرزوؤں سے حقیقتیں نہیں بدل سکتیں۔ اور نہ اسلامی دستور و آئین میں ایسے بادشاہوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ پر افسوس یہ ہے کہ ہندوستان میں عربی زبان کی یہ بے بسی اب بھی دور نہیں ہوئی اور گو پچاس ساٹھ سال سے صحیح زبان کی ترویج و تعلیم کے لیے مخلصانہ کوششیں جاری ہیں، مگر اب تک خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ اصحابِ درس ہیں، جو اب تک ارسطو کی سڑی ہوئی ہڈیوں پر فاتحہ خوانی کو "علم" سمجھے بیٹھے ہیں اور ان کے ذہن میں کسی طرح یہ حقیقت اُتر نہیں پاتی کہ کتابِ عزیز اور دین کے فہم کے لیے یونانی خرافات سے زیادہ علمِ عربیت کی ضرورت ہے۔

عربی ذوق کے نشو و نما میں دوسری رکاوٹ اچھی کتابوں کا فقدان ہے۔ مصری ریڈریں اچھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ مگر اولاً تو ہندوستانی بچوں کے مذاق پر پوری نہیں اترتیں۔ دوسرے ابھی ہمارے ہاں اس طرز کی باتصویر ریڈروں کے خلاف اچھا خاصا تعصب موجود ہے۔ مصری اور شامی ریڈروں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں عربی کے آسان کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ مگر ان کے مصنفوں کے اخلاص اور کوششوں

کی داد دیتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر زبان کے صحیح ذوق سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی کتابوں میں ایسی رکیک غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں، جن کے باعث وہ درسی کتاب بننے کے لائق نہیں رہتیں۔

ان حالات میں اگر ایک آدھ کتاب کبھی کسی ذوق اور زبان شناس مستعرب کے قلم سے نکل آتی ہے تو دل سے بے ساختہ داد نکل پڑتی ہے اور فرطِ مسرت میں قلم بہکنے لگتا ہے۔ مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی کی زیر نظر کتاب قصص النبیین للاطفال دیکھ کر اس کج مج رقم کے ذہن میں جو خیالات پیدا ہوئے۔ ان کی جھلک اوپر کی سطروں میں نمایاں ہے۔

یہ کتاب بچوں کے لیے ہے۔ درسی ریڈروں کے ساتھ عام مطالعہ (Rapid reading) کے لیے استعمال کی جائے تو بہتر ہے۔ بشرطیکہ درسی ریڈر القراءۃ الرشیدہ یا اس قسم کی کوئی دوسری ریڈر ہو۔ جدید مصر میں ایک روشناس ادیب کامل کیلانی نے 'حکایات الاطفال' کے نام سے بچوں کے از خود مطالعہ کے لیے ریڈروں کا ایک سلسلہ تالیف کیا ہے، جو تجربے سے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ راقم نے خود بھی دار العلوم ندوۃ العلماء کی مدرسی کے زمانے میں اس سلسلے کو بہت کر تجربہ کیا ہے۔ مصنف نے کامل کیلانی کا پورا چربہ اتارا ہے۔ اتنے فرق کے ساتھ کہ کیلانی نے 'سرخ مرغ' اور اس قسم کے دوسرے قصے لکھے ہیں۔ اور علی میاں نے انبیاء کے قصے منتخب کیے ہیں۔ زیر تبصرہ کتابچے میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کے قصے ہیں۔ مصنف عربی زبان کا بڑا ستھرا اور اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ ایسا اچھا مذاق کہ شاید ہندوستان میں کم لوگوں کو نصیب ہو۔ اس لیے کتاب میں کسی قسم کی عجمیت، ہندیت یا رکاکت دخل انداز نہیں ہو سکی۔

مگر بچوں کے مطالعہ کے لیے صرف ایک کتابچہ کافی نہیں ہو سکتا۔ مصنف سے ہماری درخواست ہے کہ وہ کم سے کم ایسی دس کتابیں لکھ کر عربی سیکھنے اور سکھانے والوں کا کام آسان کر دیں۔ خود انھوں نے بھی دیباچے میں اس کا وعدہ کیا ہے۔ ہم ان کی خدمت میں صرف اس قدر عرض کریں گے کہ

الکریم اذا وعد وفا (م۔ ع۔)

ذہنی زلزلے

جناب ابو السلام صاحب نعیم صدیقی۔ ۱۹۲ صفحے۔ لکھائی چھپائی کاغذ بہتریں

دار الاشاعت نشاۃ ثانیہ، حدید ملے پلی۔ حیدرآباد۔ دکن۔ قیمت ۱۲ روپے

موجودہ دور میں افسانوں اور اس طرز کے لطیف ادب کو خیالات و افکار کی تعبیر و تشکیل میں جو حیثیت حاصل ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی و فکری برتری کی عالمگیر پیکار میں افسانہ نگاروں اور ادب لطیف کے علم برداروں کو گوریلا لڑائی لڑنے والوں کا مقام حاصل ہے۔ اللہ کے جن ناتواں لیکن ارباب عزیمت بندوں نے اس پیکار میں اسلام کا علم بلند کرنے کی کوشش کی ہے یا کوشش کر رہے ہیں، الحمدللہ کہ رفتہ رفتہ ان کی صف مضبوط اور مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ مگر یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اب تک ہمیں غنیم کی صفوں میں پہنچ کر چھاپہ مار دستوں کا کام کرنے والے اہل قلم نہیں مل سکے ہیں۔ لے دے کے اب تک راقم کو اس راہ کے دو نوجوان مسافروں کا پتہ چل سکا ہے۔ جیلانی بی اے اور ابوالسلام نعیم صدیقی۔ زیر نظر مجموعہ نعیم صاحب کے مختلف ادبی مضامین کا ہے۔ مضامین مختلف قسم کے اور متنوع ہیں۔ گو ابھی نعیم صاحب کی زبان اور ٹیکنک اس درجے کی نہیں ہو سکی ہے، جہاں پہنچ کر کفر و الحاد کے قلعوں پر کامیابی کے ساتھ گولہ اندازی کر سکیں۔ پھر بھی ان کی انشا منجھی ہوئی اور قلم میں پختگی کے آثار ہویدا ہیں۔ طبیعت کی اپج اور جدت طرازی (Originality) مجموعے کے متعدد مضامین سے نمایاں ہیں اور نعیم صاحب کے پاس یہ ایسا جوہر ہے جو انشاء اللہ ان کے لیے افسانوی ادب میں ایک مقام پیدا کر کے رہے گا (م۔ع)

مبادی حکومت اسلامیہ مولانا سید سید اشرف ندوی فیض آبادی۔ ۱۶۲ صفحہ۔

لکھائی چھپائی، کاغذ متوسط۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: کتب خانہ رفعت، نظیر آباد، لکھنؤ۔

کتاب میں اسلامی حکومت کے مبادی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن طرز بیان اور مضامین کی ترتیب میں الجھاؤ کافی ہے۔ اور اسلامی حکومت کے متعلق مؤلف کا تصور بھی صاف معلوم نہیں ہوتا۔ ورنہ "غازی مصطفےٰ کمال پاشا" کی گلدستہ بندیاں کس طرح ہو سکتی تھیں؟ بہرحال اس میں کام کی باتیں بھی بہت ہیں۔

(م۔ع)

تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

ایمان اسلام تقویٰ احسان

یعنی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی وہ تقریر جو آپ نے جماعت اسلامی کے پہلے کل ہند اجتماع کے آخری اجلاس میں ارشاد فرمائی

قیمت ۶/

مطبوعہ رپن پریس، لاہور